خزاں ۱۹۸۹

آج

ترتیب: اجمل کمال

تارا شنکر بنرجی　ستیہ جیت رے

اسد محمد خاں　محمد خالد اختر

ڈونلڈ بارتھیم　ولیم سیرویان　افضال احمد سید

ذی شان ساحل　نسرین انجم بھٹی　سعیدالدین

نثر مسعود　فروغ فرخ زاد　بابا مقدم

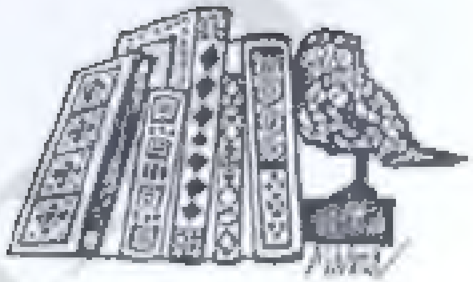

آج   ستمبر ۱۹۸۹

مینیجنگ ایڈیٹر۔ پبلشر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۳۰۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۴ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ابتدا

منتخب نظم و نثر کی کتابی سلسلے کے طور پر سات مجموعے شائع کرنے کے بعد "آج" ایک باقاعدہ جریدے کی صورت میں اپنے سفر کی ابتدا کر رہا ہے۔ سرما، بہار، گرما اور خزاں کے شمارے بالترتیب دسمبر، مارچ، جون اور ستمبر میں شائع ہوا کریں گے۔

"آج کی کتابوں" کی روایت کے مطابق ہر شمارے میں منتخب اردو تحریروں کے علاوہ مختلف زبانوں اور علاقوں کے ادب کے ترجمے بھی شامل ہوں گے۔ اس شمارے کے مندرجات کی تفصیل آپ اگلے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں۔

"انتخاب" کے عنوان سے ایک گوشہ ہر بار کسی ایک مصنف یا موضوع کے تفصیلی مطالعے کے لیے مخصوص ہو گا۔ اس بار نیر مسعود کی نثری تحریروں اور نظم و نثر کے ترجموں کا انتخاب اس گوشے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"آج" کی ابتدا اس اعتماد کے ساتھ کی جا رہی ہے کہ پڑھنے والوں کے تعاون سے ایک اچھے ادبی جریدے کا جاری رہنا اب بھی ممکن ہے۔ یقین ہے کہ اسے اچھا بنانے اور جاری رکھنے میں آپ کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

ترتیب

۹

تارا شنکر بنرجی

جلسہ گھر

۲۳

ستیہ جیت رے

جلسہ گھر کا پرپیچ راستہ

۲۶

سید محمد خاں

بانو خوبی والی

رخ خسو شاں

۳۰

محمد خالد اختر

اجیر کا تہذیبی مرقع

۳۲

رنلڈ بارتھیم

ابّہ

۴۱

ولیم سیرویان

وہ آدمی جس کا دل پہاڑوں میں رہ گیا

۵۱

افضال احمد سید

استنبول میں لٹکا ہوا انبہ

لاوانا کے قریب

مجھے ایک کاسنی پھول پسند تھا

ملک الشعرا ثہار اِسپاریان کا ایک مطلع

۵۷

ذی شان ساحل

سرمہ

مجرم

۶۱

نسرین انجم بھٹی

چوھے

۶۴

سعیدالدین

کاٹا ہوا پتھر

Scanned with CamScanner

نظم
محبت کرنے والے
نظم
نظم
ایک درخت کی دہشت
تنہا اور دوربین
چرواہے کا خواب
دوسرا باغی
جیتی جوتی جار
میرے خواب
چیونٹیاں

انتخاب

تعارف

۵

نیّر مسعود
وقفہ
مراسلہ
ساسانی پنجم
جانِ عالم

۱۰۹

فروغ فرخ زاد
آفتاب کی طرح
اندھیری راتوں میں
ہدیہ

۱۱۳

بابا مقدّم
پنجرے

تارا شنکر بنرجی

جلسہ گھر

بشومبھر رائے حسبِ معمول صبح تین بجے اٹھے اور چھت پر ٹہلنے لگے۔ ان کا بوڑھا خدمت گار اننت تکیہ اور سیتل پاٹی لے آیا اور ان کے بیٹھنے کے لیے بچھا دیا، پھر وہ ان کا حقہ لانے نیچے چلا گیا۔ بشومبھر رائے نے ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن بیٹھے نہیں، پہلے کی طرح سر جھکائے ٹہلتے رہے۔ کچھ ہی فاصلے پر رائے خاندان کے کالی کے مندر کے پاس سفید شفاف گنگا چلی سی پاٹ میں بہہ رہی تھی۔

آسمان کے کونے میں صبح کا تارا سفید شعلے سا جل رہا تھا۔ نودولتیے گنگولی خاندان کے محل کی چھت پر بجلی کا بلب جیسے اس کی روشنی کا مقابلہ کرتا چمک رہا تھا۔ گنگولی ہاؤس کی چھت پر لگے گھڑیال نے تین بجائے۔ دو سو سال سے یہ گھڑیال رائے حویلی کی چھت پر بجتا رہا تھا۔ اب اس کی آواز وہاں سے نہیں اٹھتی تھی۔ اب بشومبھر رائے محض عادت کی بنا پر اور صبح کے تارے کے نمودار ہونے پر کبوتروں کی غٹرغوں سے جاگ اٹھتے تھے۔

صبح کی نرم رو ہوا میں لطیف سی خوشبو تھی۔ بہار اب حویلی میں اپنی آمد کا اعلان شان و شوکت سے نہ کرتی تھی، نہ رائے خاندان کے پاس اب اسے بھینٹ کرنے کو کچھ بچا تھا۔ پھول باڑی اُجڑ چکی تھی۔ مالی رخصت ہو چکے تھے۔ کچھ پھول پودے باقی رہ گئے تھے۔ 'مچکندا، بوکل، ناگیشور، چمپا۔ یہ پودے بھی رائے خاندان کی طرح بے برگ و بار تھے۔ وہ اس شکستہ، وسیع اور پرانی حویلی کی طرح قدیم، اجاڑ اور کرم خوردہ ہو چکے تھے۔

اصطبل سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔

اننت نے چلم لاکر حقے پر رکھی اور بولا "حضور!"

بشومبھر رائے اپنے خیالات سے چونکے: "ہوں۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے آئے اور سیتل پاٹی پر بیٹھ گئے۔ اننت ان کے پاس حقے کی نال تھام کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے گھوڑا پھر ہنہنایا۔ انھوں نے حقے کے دو تین ہلکے کش لیے اور بولے: "مچکندا میں پھول آنے لگے ہیں۔ اب سے کچھ

پھول میرے تربت میں ڈال دیا کرنا۔

اننت سر کھجاتے ہوئے بولا "یہاں ابھی پکی نہیں ہیں۔"

اصطبل میں گھوڑا بار بار بےتابی سے ہنہنا رہا تھا۔ **بشومبھر رائے نے بیزاری سے ٹھنڈا** سانس لیتے ہوئے کہا "کیا بلی بڑھاپے میں دیر سے انھیں لگا ہے؟ جاؤ اسے آواز دو۔ طوفان بے چین ہو رہا ہے۔ کیا تمھیں اس کی ہنہناہٹ سنائی نہیں دے رہی؟"

طوفان رائے خاندان کے بڑے اصطبل میں باقی رہ جانے والا اکیلا گھوڑا تھا۔ پچیس سال پہلے وہ جوان اور پُرجوش بشومبھر رائے کی سواری کا گھوڑا تھا۔ ہر صبح منھ اندھیرے وہ طوفان پر سوار ہو کر باہر نکل جاتے۔ لیکن دو سال پہلے جب گاؤں گاؤں مہاجن گنگولیوں کی ملکیت کی منادی کرا دی گئی تھی، تب سے طوفان کی پشت بے سوار ہو گئی تھی۔ ایک روز ان کے منیم تارا پرسن نے ان سے کہا بھی تھا "اتنی پرانی عادت چھوڑ دینے سے کہیں آپ کی صحت۔۔۔" لیکن پھر ان کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

بشومبھر رائے اس گھرانے کی ساتویں پشت میں تھے۔ اپنے جداعلیٰ کی ایک بات یاد آنے پر وہ اندھیرے میں مسکرائے۔ "لکشمی کو بس میں کرنے کے لیے علم کی دیوی سرسوتی کو راضی کرنا ضروری ہے۔ سیاہی سے کاغذ پر بنائی گئی زنجیریں اٹوٹ ہوتی ہیں۔ حساب کتاب کی زنجیر ٹوٹتی نہ رہے، تو لکشمی کہیں نہیں جاسکتی۔" وہ نوابوں کے دربار میں مہتمم تھے۔ کاغذ، قلم، سیاہی، سب کچھ موجود تھا، لکشمی جا چکی تھی۔

دفتروں سے آگے داہنی ہاتھ پر گئوشالائیں اور بائیں ہاتھ پر اصطبل تھا۔ اور آگے مندر تھا۔

بشومبھر رائے نے پکارا، "ہتنی؟"

"حضور؟" مودبانہ جواب آیا۔ جو طوفان کی ہنہناہٹ میں ڈوب گیا۔ دوسری طرف سے ہتنی کی چنگھاڑ سنائی دی۔

وہ آگے بڑھ کر طوفان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ہر پٹکتا طوفان بچوں کی طرح لاڈ کرنے لگا۔ اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے وہ بولے "بیٹا!" طوفان مالک کے ہاتھ پر منھ رگڑنے لگا۔ ادھر ہتنی بھی بے تاب ہو رہی تھی اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر زنجیریں تڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رحمت سائیس مالک کی آواز سن کر ہتنی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ "مالک، چھوٹی مالکن زنجیریں توڑ ڈالیں گی۔" اس نے نرم شکایتی لہجے میں کہا۔

ہتنی چھوٹی مالکن کہلاتی تھی۔ وہ بشومبھر رائے کی ماں کے جہیز میں آئی تھی۔ شروع میں بہو ہتنی کہا جاتا تھا لیکن ایک بار اس کے مالک دھنیشور رائے جب شکار سے لوٹے تو اس کی بیوی تھی کیونکہ اس نے ایک باگھ کو سونڈ میں جکڑ کر اور پیروں سے کچل کر مار ڈالا تھا۔ اس فرشتگی کو دیکھ کر بشومبھر رائے کی ماں اسے ساتھن (سوکن) کہنے لگی تھیں۔ اس پر ان کے شوہر نے کہا، "بہت اچھا، آئندہ سے اسے بھی مالکن کہا جائے گا۔" بشومبھر رائے کی ماں بولیں، "نہیں صرف مالکن نہیں، چھوٹی مالکن۔ یہ آپ کی دوسری بیوی ہے۔"

رحمت کی بات سن کر وہ طوفان کو چھوڑ کر چھوٹی مالکن کے پاس چلے گئے۔ طوفان ان کے پیچھے غصے سے ہنہنانے لگا۔ بشومبھر رائے نے ہتنی سے کہا، "کیسی ہو چھوٹی ماں؟" ہتنی

سونڈ موڑ کر ان کے سامنے لے آئی۔ وہ ہمیشہ سونڈ پر چڑھ کر اس پر سوار ہوتے تھے۔ سونڈ تھپتھپاتے ہوئے بولے "اب نہیں ماں، اب نہیں۔" چھوٹی مالکن جیسے سمجھ گئی اور سونڈ ان کے کندھے پر رکھ کر خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔ بشومبھر رائے نے آواز دی "ہتنیا طوفان کو باہر لے جاؤ۔"

ہتنے جھجکتے ہوئے بولا "حضور آج اس نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ جب تک آپ سوار نہ ہوں گے یہ جانے کا نہیں۔"

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چھوٹی مالکن کی سونڈ سہلاتے رہے "ماں، اچھی ماں؟"

اچانک صبح کا سناٹا بینڈ کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ بشومبھر رائے ہتنی کے پاس سے ہٹے اور پوچھنے لگے "یہ بینڈ کہاں بج رہا ہے؟"

ہتے دھیمی آواز سے بولا "گنگولیوں کے ہاں مالک کے بیٹے کا ان پراشن ہو رہا ہے۔" بشومبھر رائے نے عادتاً ہنکارا بھرا۔

اندر طوفان بینڈ کی دھن پر ٹاپیں مار مار کر ناچنے لگا۔ چھوٹی مالکن کی زنجیریں بھی گھنگھروؤں کی طرح بجنے لگیں۔ چھن چھن ۔۔۔ چھن چھن۔۔۔

بشومبھر رائے بڑے دروازے سے ہو کر پھر اندر کے اندھیرے کمروں کی طرف چل دیے۔ انھیں یاد آ رہا تھا کہ ایک وقت تھا جب ہر صبح حویلی میں بانسریاں بجا کرتی تھیں اور طوفان اور چھوٹی مالکن اس کی دھن پر ناچا کرتے تھے۔ اوپر پہنچ کر انھوں نے آواز دی "اننت!"

"حضور؟"

"منیم کو بلاؤ؟"

وہ پھر اوپر جا کر بیٹھ رہے۔ منیم تارا پرسن آیا اور ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بشومبھر رائے نے پوچھا "کیا آج سومم گنگولی کے بچے کی تقریب ہے؟"

"جی حضور؟"

"میرا خیال ہے انھوں نے ہمیں بلاوا بھیجا ہوگا؟"

"جی حضور۔"

"تو انھیں ایک چاندی کی رکابی اور ایک مہر بھجوا دو۔"

تارا پرسن خاموش کھڑا رہا۔ اس میں رد و کد کی ہمت نہ تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ اسے مالک کی بات پسند نہیں آئی۔

"جانے سے پہلے آکر مجھ سے مہر لے جانا۔" تارا پرسن چلا گیا۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ اننت نے آکر چلم بدلی اور نال ہاتھ میں لے کر کہا "حضور؟"

عادت کے مطابق انھوں نے ہاتھ بڑھا دیا اور پھر حکم دیا "جاؤ جا کر چھوٹی مالکن کا ہودہ اور گھنٹیاں نکلواؤ۔ منیم کو گنگولیوں کے ہاں جانا ہے۔"

تین پشتوں تک رائے خاندان دولت کے ڈھیر لگاتا رہا۔ چوتھی پشت نے راج کیا۔ پانچویں اور چھٹی پشتیں عیش و عشرت اور قرضوں میں پڑ گئیں۔ اور ساتویں پشت کے ساتھ ہی گھرانے کی لکشمی قرض کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اب بشومبھر رائے بیٹھے ایسے دیوتاؤں کے دیوتا لگتے تھے

Scanned with CamScanner

جسے لکشمی چھوڑ گئی ہو۔ اور یہی نہیں، رائے خاندان کے وارثوں کی قطار بھی ان پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔ ماتحت عدالت اور ہائی کورٹ کے فیصلوں سے لکشمی دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ لگتا تھا وہ صندوقچہ ہاتھ میں لیے، جانے کے لیے پریوی کونسل کے فیصلے کی منتظر ہی تھی۔

بیٹے کی بیکنو پہنچ کے تیوہار پر رائے خاندان جشن کے عالم میں تھا۔ پورے چاند کی چاندنی کے سیلاب کی طرح مکان سے کھانے پینے، کھلانے اور بانٹنے کا سیلاب رواں تھا۔ پھر بھاٹا آ گیا اور یہ فراوانی تھم گئی۔ ساتھ ہی کا یہ جشن صرف عیش و عشرت نہ رہا بلکہ زہر قاتل بن گیا۔ گھر میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ اگلی سات دنوں کے اندر اندر بشومبھر رائے کی بیوی، دو بیٹے، ایک بیٹی اور بہت سے دوسرے رشتہ دار لقمۂ اجل بن گئے۔ اوتار اگستھا کے منتظر بندھیا گری پہاڑ کی طرح صرف بشومبھر رائے سر جھکائے، بے حس و حرکت اور صابر، موت کا انتظار کرنے کے لیے باقی رہ گئے۔

لیکن نہیں، شاید یہ کہنا غلط تھا کہ وہ موت کے منتظر تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس دن کے بعد سے وہ موت کا انتظار کر رہے تھے یا نہیں لیکن ان کا پُرغرور سر کسی نے جھکا ہوا نہیں دیکھا۔ اس سر کو دو برس بعد پریوی کونسل کے فیصلے پر جھکنا تھا۔ اس سے پہلے تک، ان کی بیوی اور بیٹے بیٹیوں کی موت کے بعد بھی، جلسہ گھر کی روشنیاں جل رہی تھیں اور رات کی گہری خاموشی میں ستار اور سارنگیوں کی آوازیں، گھنگھروؤں کی جھنکار اور بلند پُرمسرت قہقہے گونجتے رہے تھے۔ کئی بار چھوٹی مالکن کی پیٹھ پر شکار کے لیے ہودہ باندھا گیا تھا اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ طوفان اس پر سارے خیش اور مایوسی کے رسیاں توڑے ڈالتا تھا۔

پریوی کونسل کے فیصلے سے رائے خاندان کی ساری جاگیر چھن گئی۔ صرف حویلی اور اس کی ملحقہ عمارتیں اور مندر کے ٹرسٹ کی جائیداد باقی بچیں۔ رائے خاندان کے جدِ اعلیٰ نے اس جائیداد کو کاغذ پر ستیاں کی زنجیریں اسی طرح پہنائی تھیں کہ اسے کوئی ہاتھ نہ لگا سکتا۔ یہ نہ تو قرق ہو سکتی تھی اور نہ کوئی قرض خواہ اسے ضبط کر سکتا تھا۔ اسی ٹرسٹ کی جائیداد سے مندر کی رسمیں چلتی تھیں، چھوٹی مالکن کی خوراک اور رحمت کی تنخواہ کا بندوبست ہوتا تھا اور باقی سب خرچے چلتے تھے۔ اب بھی گھر کے ماہانہ خرچ کے لیے نفیس خاص چاول باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ مچھلیاں مندر کا تالاب فراہم کرتا اور شکاری پرندے دلدل سے آتے تھے۔ خاندان کی شان و شوکت رخصت ہو چکی تھی لیکن یادوں کی پہنچ سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رائے خاندان کی یہ شکستہ حویلی اب بھی راجا کا محل اور حرماں نصیب بشومبھر رائے، رائے حضور کہلاتی تھی۔

کوری مرتی شان کا یہ بچا کھچا حصہ بھی نودولتیے گنگولیوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ انھیں لگتا تھا کہ ان کا نوتعمیر کردہ سونے کا محل ایک پرانے مردہ پہاڑ کی اوٹ میں ہے اور دنیا والوں کی آنکھیں اب بھی اس سونے کے محل کے بجائے اس پرانے پہاڑ پر ہی ٹھہرتی تھیں۔ رائے خاندان کی پرانی ہتھنی کو ان کی قیمتی موٹرکار کی نسبت زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

موہم گنگولی غور کرتا اور سوچتا کہ ایک نہ ایک روز اسے اس پرانے پہاڑ کی چوٹیاں ڈھانی

ہی پڑیں گی۔

گلے میں گھنٹیاں پڑتے ہی چھوٹی مالکن کا جسم فخر سے جھومنے لگا۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔

منیم تارا پرسن آ کر بشومبھر رائے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ زنان خانے کے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ اب اسی کمرے میں رہا کرتے تھے۔ دیواروں پر رائے خاندان کے بڑوں اور ان کی بیگموں کی تصویریں آویزاں تھیں جو ان کی پکی عمروں میں بنائی گئی تھیں۔ ان سب نے کامی کمخواب کی جھلملاتی ہوئی شالیں اوڑھ رکھی تھیں۔ گلوں میں رُدراکشا کے ہار پڑے تھے اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے۔ بشومبھر رائے ان تصویروں کو تک رہے تھے۔ تارا پرسن کو دیکھ کر انھوں نے آہستہ سے نگاہ ہٹائی اور پکارا۔ "آتشہ، کلہ لاؤ۔"

گدے سے کنجی نکال کر انھوں نے لوہے کی تجوری کھولی۔ اوپر کے خانے میں گھرانے کی لکشمی کا صندوقچہ رکھا تھا۔ نیچے کے خانے میں دو تین ڈبے رکھے تھے۔ انھوں نے اپنی مرحوم بیوی کے جواہرات کا ڈبہ نکالا۔ وہ تقریباً خالی تھا۔ زیور کے نام پر اس میں صرف ایک سنتھی رکھی تھی جسے دلہنوں کے سر پر باندھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ سات پشتوں سے خاندان کے وارث کی شادی پر یہ نئی دلہن کے حصے میں آتی رہی تھی۔ اس کے سوا سب زیور بک چکے تھے۔ ڈبے کے ایک چھوٹے سے خانے میں کچھ طلائی مہریں تھیں جو ان کی بیوی کو شادی پر تحفے میں ملی تھیں، کچھ انھوں نے خود دی تھیں۔ اپنی شادی کے بعد پہلی بار جاگیروں کے دورے کے موقع پر انھیں آسامیوں کی طرف سے نذرانے میں جو مہریں ملیں وہ انھوں نے بیوی کو دے دیں۔ انھوں نے خاموشی سے ایک مہر نکالی اور منیم کو دے دی۔ وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد چھوٹی مالکن کے گلے کی گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ بشومبھر رائے کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ چھوٹی مالکن کے سر پر تیل لگا تھا اور اسے سیندور کی بندیوں سے سجایا گیا تھا۔ وہ بہت خوش خوش جھومتی جھامتی چل رہی تھی۔

تیسرے پہر کو گنگولی کی بڑی سی چمکیلی موٹرکار حویلی کی شکستہ برساتی میں آ کھڑی ہوئی۔ موہم گنگولی خود باہر آیا۔ تارا پرسن اسے دیکھتے ہی دوڑا اور احترام سے اس کا سواگت کرتے ہوئے اسے اندر لے آیا۔

اننت بھی اوپر سے اسے آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوڑ کر نیچے گیا اور بیٹھک کے دروازے جلدی جلدی کھول دیے۔

موہم نے پوچھا۔ "دادا کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

کئی پشتوں سے گنگولی رائے خاندان کی جاگیر میں مہاجنی کاروبار کرتے آ رہے تھے۔ خود موہم کا باپ جناردھن بھی رائے خاندان کے بڑے کو ہمیشہ حضور کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ موہم کا یوں گستاخی سے بشومبھر رائے کو دادا کہنا تارا پرسن کو سخت ناگوار ہوا۔ لیکن اس نے خوش طبعی سے جواب دیا۔ "حضور ابھی جاگے نہیں۔ قیلولہ کر رہے ہیں۔"

موہم بولا۔ "تو انھیں جگا دو۔ کہو کہ میں ملنے آیا ہوں۔"

تارا پرسن نے روکھی مسکراہٹ سے کہا۔ "اس کی تو ہم میں سے کسی میں ہمت نہیں۔ اگر آپ کو کوئی پیغام دینا ہے تو مجھے دے دیجیے۔ میں حضور کو پہنچا دوں گا۔"

Scanned with CamScanner

موہم نے بے صبری سے کہا "نہیں، مجھے انھیں سے ملنا ہے۔"
اشتہ نے شربت سے بھرا چاندی کا آب خورہ لا کر موہم کو پیش کیا۔ موہم نے شربت پی کر اس سے پوچھا "دادا جاگ رہے ہیں کیا؟"
"جی ہاں جاگ رہے ہیں۔ میں نے انھیں آپ کے آنے کی اطلاع دے دی ہے۔"
موہم شربت ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "بہت اچھی خوشبو ہے۔ کاہے کا شربت ہے یہ؟"
اشتہ نے جھوٹ بولا "مجھے نہیں معلوم۔ بنارس سے پس کر آتا ہے۔"
موہم اوپر کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہنے لگا "کیوں دادا، آپ ہمارے ہاں کھانے پر نہیں آئے؟"
بشومبھر رائے ہنس کر بولا "آؤ آؤ، بیٹھو۔"
"مجھے اس کا بہت رنج ہے دادا۔"
انھوں نے کہا "میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے بدن میں زیادہ کہیں آنے جانے کی طاقت نہیں رہی۔"
"خیر وہ تو ہوا، لیکن رات کو آپ کو ضرور آنا ہو گا۔"
بشومبھر رائے حقہ پینے کے بہانے چپ ہو رہے۔ موہم کہتا رہا "میں نے لکھنؤ سے ناچنے والیوں کو بلایا ہے۔ ان کے ناچ گانے کی داد آپ ہی دے سکیں گے۔"
بشومبھر رائے نے ایک لمبا کش لے کر حقے کی نال رکھ دی اور بولا "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے موہم۔ سینے میں درد رہنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو بہت زور کا درد ہوتا ہے۔"
موہم کچھ دیر چپ رہا، پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں اب چلوں گا دادا۔ مجھے ابھی شہر جا کر صاحب لوگوں کو لانا ہے۔ وہ بھی جلسے میں آ رہے ہیں۔"
بشومبھر رائے نے صرف اتنا کہا "میرے نہ آنے کا خیال مت کرنا۔"
کمرے سے باہر آ کر موہم دالان میں رکا اور اچانک بولا "دادا یہ مکان کی کیا حالت بنا رکھی ہے! اس کی مرمت ہونی چاہیے۔"
اس بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔ اشتہ بولا "چلیے حضور۔"

جلسے کے لیے آراستہ کیا ہوا گنگولی ہاؤس کا ہال کمرہ جھمکدار اور فراواں روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ شامیانوں کے چاروں طرف بجلی کے رنگ برنگے قمقمے دمک رہے تھے۔ بجلی کا انتظام گنگولیوں کا اپنا تھا اس لیے انھیں اس چراغاں میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ شامیانوں کے بانسوں پر پھول پتیاں اور رنگین کاغذ کی جھالریں لپٹی ہوئی تھیں۔ فرش پر گدّے، کنچنیوں اور سازندوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں اور ان پر چاندنیاں بچھائی گئی تھیں۔ ایک پہلو میں اہم مہمانوں کے لیے کرسیاں اور دوسرے پہلو میں کم اہم مہمانوں کے لیے قالین تھا۔ پچھلی طرف ایک باریک شفاف پردے کے پیچھے خواتین کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ آٹھ بجے رات تک تقریباً سارے ہی مہمان آ چکے تھے اور شامیانہ بھر گیا تھا۔ طبلچی اور سارنگیے سر ملا رہے تھے۔ پھر شہنائی سے آتی ہوئی دو ناچنے والیاں اندر داخل ہوئیں۔ انھوں نے بھی گھاگھرے اور اوڑھنیاں پہن رکھی تھیں

اور زیورات سے لدی پھندی تھیں۔ شور تھم گیا، باتیں بند ہو گئیں اور خاموشی چھا گئی۔ کنچنیاں واقعی حسین تھیں۔
موہم گنگولی اہم مہمانوں کے درمیان کرسی پر بیٹھا تھا۔ بڑی والی کنچنی نے گانا شروع کیا۔ کلاسیکی موسیقی کی طویل اور دھیمی دھن جیسے حاضرین کو سُلا رہی تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ معزز مہمانوں میں ہنسی مذاق ہونے لگا۔
گانا ختم ہو آیا ہی تھا کہ موہم انداز میں شائستگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بول اٹھا "خوب، بہت خوب!" رقص کی لے ایک دم تھم گئی۔ کنچنی گانا ختم کر کے بیٹھ رہی۔ اس نے چھوٹی والی کے کان میں کچھ سرگوشی کی اور مسکرانے لگی۔ پھر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ حاضرین میں ایک دم جان پڑ گئی۔ اس کے گانے کی تیز دھن اور ترت کے تیور پہاڑ تماشائیوں میں پہاڑی چشمے کا سا ترنم پیدا کرنے لگے۔ ہر طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی طرف سکّے اچھالے جانے لگے۔
چھوٹی کنچنی بار بار ناچتی رہی اور تماش بینوں کو نیند کا جھونکا بھی نہ لیا۔ جلسہ ختم ہونے پر موہم نے دونوں ناچنے والیوں کو بلوایا اور کہا "سب لوگ تم سے بہت خوش ہوئے۔"
بڑی والی بولی، "آپ کی عنایت ہے۔"
واقعی موہم گنگولی کی عنایات کی حد نہ تھی۔ انھیں تین روز کے لیے بلوایا گیا تھا لیکن پانچ روز تک جشن ہوتا رہا۔ ان کی روانگی سے پہلے موہم نے ان پر ایک اور عنایت کی۔ اس نے انھیں بتایا "یہاں ہمارے راجا کا محل بھی ہے۔ جانے سے پہلے وہاں بھی ہوتی جانا۔ بشومبھر رائے رئیس آدمی ہیں اور رقص و موسیقی کے قدرداں ہیں۔ شاید وہ تم سے ناچ گانے کی فرمائش کریں۔"
بڑی کنچنی نے مؤدبانہ لہجے میں کہا "حضور ہم ان کا ذکر سن چکے ہیں۔ ہم راجا بہادر کے دربار میں ضرور جائیں گے۔ ہمارا پہلے سے ہی ارادہ ہے۔"

تارا پرسن سچ مچ آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اسی بدمعاش موہم گنگولی کی شرارت ہے۔ "وہ کنچنیوں کو یہاں بھیج کر ہماری توہین کرنا چاہتا ہے" اس نے سوچا، لیکن بڑے گمبھیر لہجے میں ان کو بتایا "مالک کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ناچ گانا نہیں ہو گا۔"
کنچنی نے اصرار کیا "تم مہربانی کر کے انھیں ـــــ"
تارا پرسن نے اس کی بات کاٹی "کہہ دیا نا یہ نہیں ہو سکتا۔"
وہ اداس ہو کر بولی، "اچھا! ہماری بدقسمتی۔"
وہ دونوں جانے کے لیے مڑی ہی تھیں کہ اوپر سے پکارنے کی آواز آئی "تارا پرسن؟" تارا پرسن کے نمودار ہونے پر بشومبھر رائے نے سوال کیا "کون ہیں یہ؟"
تارا پرسن سر جھکا کر بولا "ناچنے والیاں ہیں جو گنگولیوں کے ہاں جلسے میں آئی تھیں۔"
"ہوں؟" پھر کچھ وقفے کے بعد انھوں نے پوچھا "کیا تم نے انھیں خالی ہاتھ لوٹا دیا؟"
"بندگی، حضور!" کنچنی نے فرش کو چھو کر مسلمانوں کے انداز میں آداب کیا۔ "معاف کیجیے گا مالک! ہم بغیر اجازت اندر چلی آئیں۔"

Scanned with CamScanner

بشومبھر رائے کو اس کی یوں اندر چلی آنے کی گستاخی بری لگی، لیکن اس کے حسن نے انھیں موم کر دیا۔ انھوں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا۔ انار جیسا رنگ، بڑی بڑی حسین آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی تحریر، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، دراز قد، چھریرا بدن جس میں برق کی دھیمی سی لے قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے قدم اٹھاتے ہی وہ باہر آ کر پھیلنے لگتی۔ ایک خلیق مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ پاس بچھے ایک قالین پر ادب سے بیٹھ گئی اور بولی: "بندہ حضور بہادر کے دربار میں گانے کے حکم کی منتظر ہے۔"

بشومبھر رائے کہنے ہی والے تھے کہ ان کی طبیعت اچھی نہیں، لیکن پھر انھیں شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس جیسوں سے جھوٹ بولنا ان کے مقام سے گری ہوئی بات تھی۔

کنھیّا بولی: "سب کا خیال یہی ہے کہ یہاں گانے کی صحیح داد آپ ہی دے سکتے ہیں۔ گنگولی بابو بھی بتا رہے تھے کہ آپ ہی رئیس ہیں، راجا ہیں۔"

بشومبھر رائے نے حقہ پینا موقوف کیا، ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور بولے: "آج رات کو جلسہ ہوگا۔" پھر انھوں نے آواز دی: "اننت!"

اننت باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اندر آیا تو انھوں نے کہا: "دیکھو انھیں ان کے ٹھہرنے کی جگہ دکھا دو۔ نیچے کا مہمان خانہ کھول دو۔"

اننت بولا: "آئیے۔"

بنگالی نہ جانتے ہوئے بھی وہ آسانی سے سمجھ گئی اور اننت کے پیچھے کمرے سے باہر چلی گئی۔

تارا پرسن چپ سادھے کھڑا تھا اور یونہی کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: "انھوں نے گنگولیوں سے ایک رات کے سو روپے لیے ہیں۔"

"ہوں؟" حقے کا کش لے کر انھوں نے کہا: "کیا تمھارے پاس——" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئے اور پھر حقہ پینے لگے۔

تارا پرسن بولا: "مندر کے حساب میں صرف ڈیڑھ سو روپے باقی ہیں۔"

بشومبھر رائے کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اٹھے اور تجوری سے زیوروں کا ڈبا نکال لائے۔ اس میں سے رائے خاندان کی دلہنوں کی ستھی نکال کر تارا پرسن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے: "انند میا کی ستھی خریدنے کے لیے مندر کو ڈیڑھ سو روپے لے لو۔" انند میا رائے گھرانے کی آن دیوی تھی۔

طویل عرصے کے بعد حویلی میں ایک بار پھر تالوں میں کنجیاں گھومنے کی آوازیں گونجیں۔ بڑے جلسہ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلیں۔ فانوس خانے اور توشہ خانے میں برسوں کے بعد روشنی داخل ہوئی۔

اننت کمروں کی گرد جھاڑنے اور صفائی کرنے میں مشغول ہو گیا۔ تبّو اور رحمت اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ مندر کی بوڑھی داسی بڑی کشتیوں، نقرئی پیچوانوں، گلاب دانوں اور عطر دانوں کی صفائی کر رہی تھی۔ تارا پرسن سارے انتظام کی نگرانی میں لگا ہوا تھا۔ اننت نے اس سے کہا:

"کسی کو شہر بھیجنا ہوگا۔"

منیم نے جواب دیا: "میں نے فہرست بنا لی ہے، سن لو۔ کچھ رہ گیا ہو تو بتا دینا۔" فہرست سن کر اننت بولا: "سب ٹھیک ہے، بس دو چیزیں کم ہیں، دو تولے عطر اور ولایتی شراب کی کچھ بوتلیں۔"

"ایک بوتل تو رکھی تھی؟"

"اس میں تو بس ذرا سی رہ گئی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، وہ کبھی کبھی پیتے ہیں، لیکن اگر آج انھوں نے منگا لی تو ایک بوتل کم پڑ جائے گی۔"

منیم نے کہا: "لیکن بھیجوں کسے؟ اگر کوئی پیدل گیا تو شام تک نہیں لوٹ سکے گا۔"

اننت ہچکچاتے ہوئے بولا: "کسی کو طوفان پر بھیج دیجیے۔"

تبّو نے اعتراض کیا: "جب تک حضور کا حکم نہ ہو——"

تارا پرسن نے کہا: "ٹھیک ہے، میں ان سے پوچھ لیتا ہوں۔"

بشومبھر رائے لیٹے ہوئے تھے۔ منیم کو دیکھ کر بولے: "میں تمھیں بلانے ہی والا تھا۔ تم جا کر مرحوم گنگولی کو بلاوا دے آؤ۔ گاؤں کے سب معزز لوگوں کو بھی بلاوا بھیج دو، لیکن گنگولیوں کے ہاں تمھیں خود جانا ہوگا۔"

"بہت اچھا۔"

انھوں نے مزید کہا: "اور چھوٹی مالکن پر ہودہ رکھواؤ۔"

منیم ذرا رکا، پھر بولا: "وہ تبّو کو طوفان پر شہر بھیجنا ہے۔"

"ہاں بھیج دو۔"

جلسہ! آج ایک طویل عرصے بعد حویلی میں جلسہ ہو رہا تھا۔

کہیں سے، شاید جلسہ گھر سے، فانوس کی لٹی قلموں کے ٹکرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بشومبھر رائے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گئے۔ اننت دیواروں پر کانچ کے لیمپ اور فانوس ٹانگ رہا تھا۔ چاپ سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا، اور بشومبھر رائے کو وہاں کھڑے پایا۔ وہ دیواروں پر آویزاں تصویریں دیکھ رہے تھے۔ چاروں طرف کی دیواروں پر رائے خاندان کے بزرگوں کی عالم شباب کی تصویریں لگی تھیں۔ جدِاعلیٰ سے لے کر خود ان تک سب مسرور اور عیش پسند دکھائی دیتے تھے۔ پردادا راونیشور رائے ہاتھ میں نیزہ لیے، پیٹھ پر سپر رکھے اپنے شکار کیے ہوئے شیر پر پاؤں رکھے کھڑے تھے۔ باپ دھنیشور رائے ایک گدی پر بیٹھے تھے اور پاس ہی چھوٹی مالکن گھٹنے ٹیکے بیٹھی تھی۔ نوجوان بشومبھر رائے طوفان کی پیٹھ پر سوار تھے۔

گھرانے کے وارثوں نے اس کمرے میں بہت سے طوفانی ناٹک کھیلے تھے۔ ان میں پہلے راونیشور رائے تھے جو ہنگامہ خیز زندگی کے عادی ہوئے۔ انھوں نے یہ جلسہ گھر بنوایا تھا، لیکن وہ خود اس سے حظ نہ اٹھا سکے۔ بشومبھر رائے کو یاد آنے لگا، جس روز اس میں پہلی بار محفل جمی، اسی روز راونیشور رائے کی بیوی اور بیٹا بجرے میں دریا پار کرتے ہوئے بھنور میں ڈوب گئے۔ کانچ کے فانوسوں کو بجھا دیا گیا، صرف چند موم بتیاں جلتی رہیں۔ اس کے بعد انھیں پھر کبھی جلسہ

Scanned with CamScanner

ان کے دروازے کھلوانے کی خواہش یا ہمت نہ ہوئی۔

شاید بہتر ہوتا کہ رائے گھرانا بھی وہیں ختم ہو جاتا، لیکن راویشور رائے کی خاندان کا نام چلانے کی خواہش بہت طاقتور تھی۔ انھوں نے اپنی سالی سے شادی کر لی۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا نے انھیں یہ حکم دیا ہے۔ پھر ان کے بیٹے تاراکیشور رائے نے ایک بار پھر جلسہ گھر کھلوایا اور اس میں روشنی کی۔ ایک بار اپنے ایک دولت مند دوست سے مقابلہ میں انھوں نے ایک ناچنے والی کو پانچ سو طلائی مہریں دے ڈالی تھیں۔

تب بشومبھر رائے اپنی زندگی کے واقعات پر غور کرنے لگے۔ چندرا، انھیں چندرا بائی یاد آئی۔ ایک بار محفل ختم ہونے کے بعد وہ اپنے دوستوں کو جل دے کر اسے ڈھونڈنے نکل گئے تھے۔ انھیں اب بھی چندرا کے ساتھ اس راستے سے گزرنا یاد تھا۔ پھولوں سی حسین اور تروتازہ چندرا۔ وہ ایک خوش گوار اور ناقابل فراموش یاد تھی۔

اننت کام کرتے کرتے رک گیا۔ مالک کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ان کا چہرہ ہیجانی اور سرخ ہو رہا تھا جیسے اچانک کسی بند رگ سے لہو فوارے سا چھوٹ پڑا ہو اور چہرے پر پھیل گیا ہو۔

موٹر کار کے ہارن کی بلند آواز۔ مہم گنگولی! سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ رنگت کی آوازیں اور پھر باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد جلسہ گھر سے ستار کے تار چھیڑنے اور طبلے پر تھاپ پڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سُر ملائے جا رہے تھے۔

اننت اوپر آیا اور دروازے ہی سے بولا "حضور سب انتظار کر رہے ہیں۔"

بشومبھر رائے لباس تبدیل کر کے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ بولے "اچھا، میرے جوتے لاؤ۔"

اننت ذرا سا ہچکچایا، پھر کونے کی الماری سے اس نے ایک بوتل اور گلاس برآمد کیے اور انھیں چھوٹی میز پر رکھ کر جوتے لانے چلا گیا۔ بشومبھر رائے ساکت کھڑے دیکھتے رہے۔ نیچے ستار کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اننت نے کہا "حضور؟" انھوں نے حسب عادت جواب دیا "ہوں"۔ اور پھر ٹہلنے لگے۔ ان کی چال تیز ہو گئی تھی۔ اننت منتظر کھڑا تھا۔ وہ مڑ کر پاس آ گئے اور اس سے بولے "سنو!"

وسیع ہال میں تین دیواروں کے ساتھ ساتھ موٹی سوزنی کی پٹی پر چاندنیاں بچھائی گئی تھیں۔ چھت پر تین بڑے فانوس قطار میں لٹک رہے تھے۔ دیواری لیمپوں میں جلنے والی بتیاں ہوا سے جھلملا رہی تھیں۔ ان میں کچھ لیمپوں کے شیشے غائب تھے اور کچھ کی موٹی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ان بجھی ہوئی بتیوں کے طویل سائے دیواروں پر جیسے ایک دبی ہوئی سنسناہٹ کو جنم دے رہے تھے۔

ساڑھے کے سر کھلنے لگے۔ تیس چالیس مہمان ابھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ پانچ پیچوانوں پر کش لیے جا رہے تھے۔ دونوں ناچنے والیاں خاموش بیٹھی تھیں۔ صرف کبھی کبھی مہم گنگولی کی آواز سب آوازوں سے اونچی سنائی دے جاتی تھی۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس نے بجھی ہوئی بتیوں کی طرف دیکھا اور بول اٹھا "دیکھنا، کئی بتیاں بجھ گئی ہیں۔" کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ پھر اس نے پکار کر کہا "منیم بابو؟" تارا پرسن کے آنے پر وہ بولا "دیکھو بتیاں دھیمی ہیں اور محفل میں روشنی کم ہے۔ میرے ڈرائیور سے کہو کہ وہ جا کے دو پیٹرومیکس لے آئے۔" تارا پرسن خاموش رہا لیکن بڑی والی کنچنی آہستہ سے بولی "وہ روشنی اس کمرے میں اچھی لگے گی؟"

باہر سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی تو تارا پرسن مؤدبانہ انداز میں باہر چلا گیا۔ دوسرے مہمان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہم گنگولی بھی غیرارادی طور پر اپنی جگہ سے تھوڑا سا اٹھا، لیکن اس کا احساس ہوتے ہی پھر بیٹھ گیا۔

بشومبھر رائے نے مسکراتے ہوئے معذرت کی "معاف کیجیے گا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" پھر وہ بیٹھ گئے۔ مہم نے ایک گاؤتکیہ کھینچا لیکن پھر اسے مٹاتے ہوئے جیب سے رومال نکالا اور اسے جھاڑتے ہوئے بہت ناگواری سے بولا "ارے توبہ! اس میں تو گرد ہی گرد ہے۔" تارا پرسن مہمانوں کو عطر پیش کر رہا تھا۔ اننت نے پیچوانوں کی چلمیں بدلیں اور بشومبھر رائے کا اپنا حقہ لا کر اس کی نال انھیں پیش کی۔

بڑی کنچنی آداب کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گانا اسی طویل کلاسیکی دھن سے شروع ہوا، لیکن فرق یہ تھا کہ یہاں حاضرین سب خاموش تھے۔ بشومبھر رائے آنکھیں بند کر کے محویت سے سننے لگے۔ ان کا بھاری بھرکم جسم لے پر جھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے پہلو میں پڑے گاؤتکیے پر تال دینے لگتے۔ یکلخت طبلے پر تھاپ پڑی اور انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ گھنگھروؤں کی جھنکار آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور رقص شروع ہوا۔ ایک سچے فنکار کا اظہار۔ اس کے پھیلے ہوئے گھٹا دیکھ کر بے اختیار تاج الفت والے مور کی یاد دلاتے تھے۔ گردن سے خم پڑ نے لگا، دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے گھاگھرے کے کونے رقص کا ساتھ دیتے ہوئے مور کے پر معلوم ہونے لگے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار تیزتر ہوتی گئی۔ بشومبھر رائے نے بلند آواز میں داد دی "خوب، خوب!"

آہستہ آہستہ ناچنے والی کے قدم تھم گئے، گانا ختم ہوا اور طبلے پر آخری تھاپ پڑی۔

مہم بشومبھر رائے کے قریب آ کر سرگوشی میں کہنے لگا "دادا موسیقی جاندار نہیں ہے۔ مہمان اونگھ رہے ہیں۔ میرا بھی گلا سوکھ رہا ہے۔ کرشنا بائی نے مزا کرکرا کر دیا۔"

کرشنا بائی مسکرائی۔ وہ شاید مہم کی بات سمجھ گئی تھی۔ اننت نے شربت لا کر مہم کو پیش کیا۔ مہم نے انکار کر دیا اور کہنے لگا "پچھلی کئی راتوں سے جاگنے کی وجہ سے مجھے زکام ہو گیا ہے۔"

بشومبھر رائے نے مسکرا کر اننت کو اشارہ کیا۔ وہ ایک کشتی میں وسکی کی بوتل، سوڈا اور گلاس لے آیا۔

اننت نے جام بنا کر مہم کو دیا۔ پھر ایک اور جام بنا کر مہمانوں کی طرف دیکھا۔ لیکن سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اننت نے جام بشومبھر رائے کو پیش کیا۔ انھوں نے خاموشی سے اٹھا لیا۔ مہم چھوٹی کنچنی کو گھور رہا تھا۔ کچھ دیر پہلو بدلنے کے بعد وہ بولا "پیاری بائی! اب ذرا

وہ کمرے میں فخر سے سر اونچا کیے بے مقصد ٹہل رہے تھے۔ رائے خاندان کے وقار کا بھرم رہ گیا۔ خراب اور اضطراب سے ان کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ آج ان کا زمان و مکان کا احساس تہ و بالا ہو گیا تھا۔ وہ بےخیالی میں کمرے سے باہر نکل آئے۔ جلسہ گھر کی روشنیاں انھیں مقناطیس کی طرح کھینچنے لگیں۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ جلسہ گھر خالی تھا۔ صرف دیوار پر رائے خاندان کے وارثین وقت کی قید سے آزاد، بیدار تھے۔ بشومبھر رائے کھلی کھڑکیوں سے باہر تکنے لگے۔ ہرکچھ ہر شے چاندنی کے سیلاب میں تھی۔ مچکندا کی خوشبو نرم رو ہوا میں تیر رہی تھی۔ ایک پیڑ پر کوئل کوک رہی تھی۔ "پی کہاں؟ پی کہاں؟"۔ اچانک ایک بھولا ہوا گیت ان کے دل میں گونجا، چندرا بائی کا گایا ہوا گیت۔ انھوں نے کھڑکی میں سے آسمان پر نظر ڈالی اور چاند کو آسمان میں بلند دیکھا۔ اچانک قدموں کی چاپ سن کر وہ مڑے۔ اننت بتیاں بجھانے آیا تھا۔

بشومبھر رائے نے کہا، "بتیاں جلی رہنے دو۔" اننت واپس جانے لگا تو انھوں نے آواز دی، "میرا ایسراج لاؤ۔"

اننت ایسراج لے آیا۔ وہ اسے گھٹنوں پر رکھ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے اور حکم دیا، "جام پُر کرو۔" انھوں نے کشتی میں رکھی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ اننت نے ایک جام بنا کر انھیں پیش کیا اور باہر چلا گیا۔ انھوں نے ایسراج کے تار چھیڑے۔ سوئی سوئی سی سُر بلند ہوئے۔ بشومبھر رائے خود فراموشی کے عالم میں ایسراج بجاتے رہے۔ اس کے تاروں سے کیا صدا بلند ہو رہی تھی؟ اس گیت کے بول ان کے کانوں میں گونجنے لگے:

"آہ اس اندھیری رات میں، میں ابھاگن قید ہوں۔ نیند دروازے پر پہرا دے رہی ہے۔ نیند میری آنکھوں سے دور ہے۔ نیند کے بہانے میں تمھاری پوجا میں مگن ہوں۔ کرشن تم کیوں مرلی بجاتے ہو؟"

بشومبھر رائے ایسراج ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ سے پکارا، "چندرا!"

چندرا! ان کی چندرا! یہ گیت بھی چندرا کا تھا۔ باہر سے کسی کی شیریں آواز آئی، "حضور؟"

بشومبھر رائے بیتاب ہو کر پکارے، "چندرا! چندرا! یہاں آؤ۔ اب سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں۔"

کرشنا بائی نے آ کر شرمیلے انداز میں آداب کیا۔ اور وہی گیت جو ایسراج کے تاروں نے چھیڑ رکھا تھا، ہولے ہولے گنگنانے لگی۔ ہنس کر بشومبھر رائے بھی اس کا ساتھ دینے لگے، "کتنی حسین رات ہے۔ میرا من خوشی سے بھر گیا ہے۔ ایسی رات میں کون اکیلا رہ سکتا ہے۔"

وہ جام پُر کرنے کے لیے بوتل کا کاگ کھولنے لگے۔ کرشنا بائی نے ہاتھ بڑھا کر کہا، "حضور اجازت دیں تو یہ بندی جام بنا دے۔" بشومبھر رائے مسکرائے اور بوتل اسے دے دی۔

ایسراج کے تار پھر چھڑ گئے، اور کرشنا بائی گانے لگی۔ پھر اس نے رقص شروع کیا۔ وہ گا رہی تھی: "پریتم میں گری ہوئی پتیوں کی مالا نہیں بناتی۔ مجھے وہ پھول لا دو جو بہت اونچے کھلے ہیں، یا مجھے ان تک پہنچا دو۔ مجھے تمھارے لیے مالا بنانی ہے۔" وہ اپنے بازو اوپر اٹھا رہی تھی۔ بشومبھر رائے نے ایسراج ایک طرف رکھ دیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر اوپر اٹھا

تم اپنے شعلوں سے کچھ گرمی پیدا کرو۔" پیاری بائی نے ایک طرح گانا شروع کیا۔ بشومبھر رائے آنکھیں بند کیے سنتے رہے، کہنے میں ایک وقفے پر بولے، "ذرا آہستہ۔" لیکن پیاری بائی اپنی عادت کے مطابق شوخی اور شرارت سے ناچتی گاتی رہی۔ موہم بار بار اونچی آواز میں داد دیتا رہا۔

بشومبھر رائے کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ موہم کی بےمحل تحسین انھیں ناگوار ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ بین کی آواز سے مسحور سانپ کی طرح گانے کی لے پر جھومتے رہے۔ ان کی رگوں میں رائے خاندان کا گرم خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ پیاری بائی رنگین پروں والی تتلی کی طرح ادھر سے ادھر ناچتی رہی۔ اس پر انھیں لکھنؤ کی ایک اور کنچنی زہرہ یاد آنے لگی۔ کرشنا بائی ان کی چندرا بائی کی طرح تھی۔ وہی چندرا بائی جو ان کی زندگی کے ایک باب میں شامل رہی تھی۔ پیاری بائی کا رقص ختم ہوا۔ بشومبھر رائے گئے دنوں کے خیالوں میں محو تھے۔ سکوں کی جھنکار نے انھیں چونکا دیا۔ موہم پیاری بائی کو چاندی کے سکے دے رہا تھا۔ یہ بات آداب کے خلاف تھی۔ بخشش دینے کا پہلا حق میزبان کا تھا۔ بشومبھر رائے نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کے سامنے کچھ نہ تھا، نہ چاندی کا طشت نہ سکے، جنھیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ وہ فرش پر نظریں گاڑے چپ بیٹھے رہے۔ پھر کرشنا بائی نے گانا شروع کیا۔ ساحل سے ٹکراتی لہروں کی طرح اس کا گیت کمرے میں پھیلنے لگا۔ وہ جمنا کی لہروں کی مستی کا گیت گا رہی تھی جو کرشن کی مرلی سن کر اس سے ہمکنار ہونے کو تڑپتی تھیں۔ گیت اور رقص دونوں بےحد لطیف تھے۔ بشومبھر رائے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو گئے اور گانا ختم ہوتے ہی بےاختیار بولے، "بہت خوب چندرا بائی!"

کرشنا بائی نے آداب بجا لا کر کہا، "بندی کا نام کرشنا ہے۔" دوسری طرف سے موہم نے چلا کر کہا، "یہ لو کرشنا بائی، بخشش!"

بشومبھر رائے اٹھ کھڑے ہوئے، اور آہستہ آہستہ جلسہ گھر کو پار کر کے باہر نکل گئے۔

موہم بولا، "پیاری بائی، اب تم کچھ سناؤ۔"

کرشنا بائی نے کہا، "حضور بہادر کو آ جانے دیجیے۔"

موہم نے کہا، "آ جائیں گے آ جائیں گے ان کا کیا ہے۔ لو میرا خیال ہے وہ آ گئے۔" لیکن یہ تارا پرسن تھا۔ اس نے چاندی کا ایک طشت جس پر دو طلائی مہریں رکھی تھیں، کنچنیوں کے سامنے رکھ دیا۔ "مالک نے بھیجا ہے۔"

موہم نے بےصبری سے پوچھا، "لیکن وہ خود کہاں ہیں؟"

"ان کے سینے میں درد ہے۔ وہ نہیں آ سکتے۔ انھوں نے کہا ہے کہ محفل جمی رہے۔" مہمانوں میں یہ سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ موہم تحقیرآمیز انداز میں جماہیاں لیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں تارا پرسن۔ صبح مجسٹریٹ صاحب مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔"

تارا پرسن کچھ نہ بولا۔ دوسرے مہمان بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل ختم ہو گئی۔

بشومبھر رائے کی بیوی کے جواہرات کا ڈبا فرش پر پڑا تھا۔ خالی۔

Scanned with CamScanner

[illegible] رقص کرنے [illegible] لگیں۔ ان کے پیر زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ گیت ختم ہوتے ہی کرشنا بھگتی سے گرنے کا بہانہ کر کے ایک چیخ مار کر مدہوش ہو گر۔ شوسمبھر رائے اسے بار بار پکارنے لگے "چندرا! چندرا! میری جان!"

گیت پر کیف [illegible] ہوئی۔ دوسرے بھی خالی ہونے لگی۔ پھر بھکتی سے چور [illegible] فرش پر [illegible] گئی۔ شوسمبھر رائے [illegible] کی طرح سیدھے بیٹھے رہے۔ [illegible] کی حالت دیکھ کر وہ [illegible] مسکرائے۔ پھر ایک تکیہ [illegible] سے اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ دوبارہ [illegible] لگے۔ چمک گھنگروں اور پائل سے گھڑیال کی صدا [illegible] خوشی سے بج گئی!

حویلی کے ستونوں کے اوپر کی جھلملیوں میں کبوتر غٹرغوں کرنے لگے۔ شوسمبھر رائے چونک [illegible] صبح [illegible] کھڑے ہوئے۔ [illegible] پکارا: "چندرا، میری جان!" پھر وہ دالان میں گئے اور اننت کو آواز دی۔

[illegible] شوسمبھر رائے نے حکم دیا "میری سواری کی گھوڑے لاؤ۔ آج میں کیو طوفان پر زین کسیے جلدی!"

اننت نے حیرت سے مالک کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ نظر سے اپنی مونچھوں [illegible] تاؤ دے رہے تھے۔

[illegible] شوسمبھر [illegible] طوفان پر سوار ہو رہے تھے۔ [illegible] محسوس ہو کہ [illegible] کام والے جوتے پہن رکھے تھے اور ہاتھ میں چابک تھی۔ طوفان روانہ ہو گیا۔

[illegible] طوفان [illegible] رفتار سے دوڑ [illegible] صبح کی ٹھنڈی ہو شوسمبھر [illegible] سے نکوا [illegible] ان کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ کھیت پار کر کے وہ کسی گاؤں میں پہنچے [illegible] ایک بیل گاڑی گزر رہی تھی۔ اس میں دو [illegible] تھے [illegible] کے کانوں سے چند الفاظ ٹکرائے "جب سے گنگوریوں نے جاگیر خریدی ہے۔"

شوسمبھر رائے نے ایڑ لگا کر سوفان کی رفتار تیز کر دی۔

بیل گاڑی والے کہہ رہے تھے، لیکن ان کو کچھ بھی نہیں پہچان۔ رائے راجا کی رانی میں ہم کتنے سکھی تھے۔"

شوسمبھر [illegible] دیکھا [illegible] چونک پڑے [illegible] طوفان کو [illegible] لیکن وہ کہاں [illegible] جیسی ہو [illegible] جاگیر کے ایک گاؤں میں آگئے تھے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ طوفان کی باگیں واپس موڑ دیں اور اسے چابک مارنے لگے۔ گھوڑی سرپٹ دوڑنے لگا۔ اصطبل کے سامنے پہنچ کر وہ ذرا رکے۔ پورب سے سورج کی کرنیں [illegible]

[illegible] آواز دی "اننت!" وہ چاہتے رہے تھے۔ انہیں احساس ہو کہ طوفان بھی ہانپ رہا ہے۔ [illegible]

اس کی پیٹھ پر سے اتر آئے اور دیکھا کہ اس کا منہ کٹ گیا ہے اور خون بہہ رہا ہے۔ طوفان تھک کر گر پڑا۔ شوسمبھر رائے نے اس کا سر سہلایا اور بولے، "بیٹا! بیٹا!" لیکن طوفان اٹھ نہ سکا۔ [illegible] ان کا نشہ شاید پوری طرح نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ بڑبڑائے "غلطی ہو گئی بیٹا! مجھ سے بھی اور تم سے بھی۔ مگر شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے! اٹھو بیٹا، طوفان، اٹھو!"

اننت پیچھے منتظر کھڑا تھا۔ بولا "تھک گیا ہے۔ آرام کر کے اٹھ کھڑا ہو گا۔"

شوسمبھر رائے چونک کر مڑے اور اننت کو دیکھا۔ طوفان کو اس کے حوالے کر کے وہ حویلی میں چلے گئے۔ [illegible] جلسہ گھر کے دروازے کھلے تھے۔ [illegible] وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ شراب کی بوتلیں فرش پر لڑھکی پڑی تھیں۔ [illegible] فانوسوں [illegible] کی ساری بتیاں بجھ چکی تھیں۔ [illegible] رائے خاندان کے وارث [illegible] مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھیں۔ شوسمبھر رائے ڈر کر پیچھے ہٹے۔ انہیں لگا یہ انہیں کا عکس ہے۔ نہ صرف ان کے بلکہ رائے خاندان کی ساتویں پشت کی [illegible] جلسہ گھر میں جمع [illegible] وہ دروازے سے پیچھے ہٹے [illegible] دالان کے جنگلے کا سہارا لے کر بچوں کی طرح چیخے "اننت! اننت!"

اننت دوڑا ہوا آیا۔ اس نے اپنے مالک کو کبھی یوں چلاتے نہ سنا تھا۔ اس کے آتے ہی وہ پھر چلائے "بتیاں بجھا دو! بتیاں بجھا دو! جلسہ گھر کے دروازے بند کر دو! جلسہ گھر کے—"

پھر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ صرف ان کے ہاتھ سے چابک نکلا اور جلسہ گھر کے دروازے سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

(بنگلہ)

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

ستیہ جیت رے

جلسہ گھر کا پرپیچ راستہ

"لیکن کیا آپ لتیتا تک گئے؟ وہاں کی حویلی دیکھی آپ نے؟" پھوس کی چھت والے چائے خانے میں اس معمر آدمی نے پوچھا۔ ہم شکتی سے ڈیڑھ سو میل دور لالی گولا کے گاؤں میں بیٹھے تھے۔ ابھی ابھی ہم تیرہویں پرانی حویلی کو دیکھ کر اور غیر مناسب قرار دے کر رد کر چکے تھے۔

"لتیتا؟ وہ کہاں ہے؟" ہم نے کسی ولولے کے بغیر پوچھا۔ ہم نے اس جگہ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔

"یہ یہاں سے ساٹھ میل دور شمال میں ہے۔ پہلے سڑک سے جاتے ہیں پھر ایک دریا پار کرنا ہوتا ہے۔ اپنی کار آپ کشتی میں رکھ کر لے جا سکتے ہیں۔ پھر سڑک پر بیس میل اور۔ وہاں … سے آپ کو پتا چل جائے گا کہ کہاں مڑنا ہے۔ یہ پدما کے بائیں ہاتھ پڑتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان ہے۔ لتیتا میں چودھریوں کی حویلی ہے۔ میں کافی دیر سے آپ لوگوں کی باتیں سن رہا تھا، اور میرا خیال ہے آپ کو مایوس ہونے سے پہلے یہ جگہ دیکھ لینی چاہیے۔"

ہم ان لوگوں کے ملنے مشوروں کو بہت شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جنھیں غالباً ہماری ضرورت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال، اب سوال صرف یہ تھا کہ ہم اس آخری مہم پر جائیں یا نہیں۔ اگر یہ حویلی بھی پسند نہ آئی تو سارے منصوبے کو ترک کرنا پڑے گا، یا پھر کسی گھٹیا سمجھوتے سے کام چلانا پڑے گا۔ سکے کی ایک اچھال نے فیصلہ کر دیا، اور ہم ایک ساٹھ میل لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔

جب میں نے تارا شنکر بنرجی کی مشہور کہانی "جلسہ گھر" کو فلمانے کا فیصلہ کیا، اس وقت میں اپنی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھائے بستر پر دراز تھا۔ بنارس میں پتھر کی سیڑھیوں سے پھسل جانے سے میرے گھٹنے میں بری طرح چوٹ لگی تھی۔ میں بستر میں … بنگالی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں … میری ساکھ کچھ ایسی مضبوط نہیں تھی اور شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میں نے غیر شعوری طور پر "جلسہ گھر" کا انتخاب

یہ ایک ڈرامائی کہانی تھی جسے جائز طور پر ماجرا … سمجھا جا سکتا تھا، اور … کے دیوانے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس میں موڈ، ماحول اور … کی بھی بہت گنجائش تھی۔ میں نے ایک صاف ستھری … کی … اس کہانی کے حق میں فیصلہ کیا۔ موسیقی کی محفلیں منعقد کرنے کے شوق کے ہاتھوں تباہ ہو جانے والے زمیندار کے … کہ … جیسی … کو … ہر … سب سے عظیم اداکار ہیں۔ لیکن سب سے گمبھیر مسئلہ حویلی کی تلاش کا تھا۔ بجٹ کے محدود ہونے کی وجہ سے اسٹوڈیو میں سیٹوں کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایسا کرنا پڑا … کی … محل تیار کرنے کے لیے میرے آرٹ ڈائریکٹر پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے رقم کہاں تھی؟

لتیتا وہ سب کچھ ثابت ہوا جس کا اس بوڑھے شخص نے دعوا کیا تھا، بلکہ اس سے زیادہ۔ اس حویلی پر چھائی ہوئی بے پناہ گہری ویرانی کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تھا۔ گزرے ہوئے برسوں میں پدما نے اپنا پاٹ اس طرح بدل لیا تھا کہ جہاں پہلے گاؤں رہے ہوں گے وہاں اب دور دور تک ریتیلی ویرانی تھی، اور خود حویلی بھی … ہمارے … کا … تھی۔ وہ ایک شکستہ اور خستہ … معلوم ہوتی تھی۔ وہ دریا کی موج کے ہاتھوں نیست و نابود ہونے سے معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ … اس کے سامنے دس گز کے فاصلے تک چڑھ آیا تھا … اور … کو … کر کے ٹھہر گیا تھا۔ … چودھری … جو اس حویلی اور … ایک خطاب کے مالک تھے، اس واقعے کو ہمارے سامنے دہرایا۔ "ایک صبح ہم جاگے تو … ہمیں ہلکی سی گرج سنائی دی … سب صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ پدما کی بھوک تو ضرب المثل ہے۔"

"مگر کیا آپ کو اس کا خوف نہیں کہ دریا اور آگے بھی آ سکتا ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں، ہر بار برسات کا موسم یہی اندیشہ لاتا ہے۔"

"تو پھر آپ اس جگہ کو چھوڑ کیوں نہیں جاتے؟"

"اسے چھوڑ کر چلے جانے پر ہم اس کے ساتھ ڈوب جانے کو ترجیح دیں گے۔"

لتیتا کی حویلی بہترین انتخاب تھی۔ مسئلہ صرف جلسہ گھر کا تھا۔ ویسے تو اس حویلی میں ایک جلسہ گھر موجود تھا (گیندر نرائن چودھری کے چچا … چودھری ہماری کہانی کے مرکزی کردار کی طرح موسیقی کے شائق رہے تھے) لیکن یہ اتنا متاثر کن نہ تھا کہ … شاندار محفلوں کے منظر کے محل وقوع کے لیے کام دے سکے جن کا میں نے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اسے … طرز میں اسٹوڈیو میں تعمیر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر ہماری کہانی کے … اور عناصر سے چودھری محروم تھے۔ ایک تو ہاتھی، جو ان کے پاس بیس سال پہلے تک تھا مگر اب نہیں، اور دوسرے سفید … گھوڑا … کے ایک … اصطبل میں تلاش کر لیا گیا۔ یہ ایک ایسے رئیس کی ملکیت تھا جو اپنے اچھے دن گزار چکا تھا اور اب گھوڑے کا خرچ

[illegible] ہمارے پاس دو سو روپے میں
فروخت کر دیا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

لتیتا سے پہلی بار لوٹ کر میں نے کہانی کے مصنف مسٹر بنرجی کو ٹیلیفون کیا۔ وہ بھی صاحب لوکیشن کے سلسلے میں اتنے ہی بیتاب تھے جتنے ہم لوگ۔

"مسٹر بنرجی، بالآخر ہم نے بھی حویلی ڈھونڈ لی"، میں نے کہا۔

"اچھا! کہاں ہے وہ؟"

"ایک گمنام سی جگہ ہے، لتیتا نام کی۔"

"کیا؟ لتیتا؟" ان کی آواز میں ایسی کیفیت تھی جیسے وہ اس جگہ کو پہچان رہے ہوں۔ "کہیں چودھریوں کی حویلی تو نہیں؟"

"ہاں کیوں؟"

"کیونکہ یہ تو حیرت ناک بات ہوا میں کبھی لتیتا نہیں گیا، لیکن میں نے بنگالی زمینداروں کی ایک تاریخ میں چودھری گھرانے کا حال پڑھا تھا اور موسیقی کے شائق [illegible] چودھری کا حال پڑھ کر میں نے مشرسمبھر رائے کا کردار تخلیق کیا تھا۔"

انگریزی سے ترجمہ: جمیل کمال

اسد محمد خان

تے ڈو ہوسپی ٹالٹی *

سرکار! کوئی جان گلکرائسٹ صاحب آئے ہیں
[illegible]، پوچھو کیا شوق فرمائیں گا
حضور! کہتے ہیں پولو کھیلیں گا
تو ہاتھی پر اُن کو بھیج دو

سرکار! امریکہ [illegible] سے کوئی [illegible] آئی ہیں
[illegible]، پوچھو کیا شوق فرمائیں گا
حضور! کہتی ہیں ڈھاتھا دیکھیں گی
یہ خوشبو کہہ دو گرم پرواز ہے، فلک پہ ناہید [illegible] رہا ہے
اور کہہ دو ہم جم اٹھے، یہ بدشگونی نہ فرمائیں—
مگر ٹھہرو، مہمان ہیں، اس طور لوٹانا بھی تو نہیں جا سکتا
(یہیں کہیں تو کھٹ پٹ کر رہے تھے
یہ اپنے جڑی منڈی والے ڈاکٹر کہاں گئے؟)

* Native Hospitality

Scanned with CamScanner

برجِ خموشاں

میں ایک زیرِ تعمیر عمارت میں ہوں۔
یہ ایک برج سا ہے۔

برج کسی نامقدس نامعمار تولیم کی طرح ایک طرف جھک گیا ہے۔ ابتدا میں اسے کرہ کی رکز قرار دے کر عموداً نصب کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا مگر بنیادی مدد ہاسر سے کام لے کر اسے بڑھا کر دیا گیا۔ پھر زمین کی کشش دو بڑی سخت چیزوں پر حاوی ہو گئی۔ اس لیے برج زیادہ فاصلہ نامے سے قاصر رہا اور ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ جب یہ ہو چکا تو خاموشی کے ساتھ طے کیا گیا کہ اب اسے صرف کریاکرم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس طرح زندوں کی لیے تعمیر ہونے لی اس عمارت کو برجِ خموشاں بنا دیا گیا، اور یہ بات مجھ سے چھپائی گئی۔

مجھے برج کے جھک جانے پر یا اس کے نئے استعمال پر یا بات کے چھپائے جانے پر کوئی عمرا ض نہیں۔ اب تو کسی چیز پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اسے کرنا چاہیے جس کے من میں کچھ ہو۔ میرے من میں کچھ نہیں ہے۔ صرف تماشائی ہونا میرے اختیار میں ہے، اس لیے میں صرف تماشا دیکھ رہا ہوں۔

میں سر اٹھائے برجِ خموشاں کی دیوار سے نظر آتی روشن آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ مُردارخور پرندوں کے غول روشن آسمان کے مقابل آ کر اسے ڈھک لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بصری دھوکا ہو (میلی وژن پر ابھی ابھی دیکھ لیا گیا ہے) مگر میں اپنی ہڈیوں میں محسوس کر رہا ہوں کہ ابتلا کا آغاز ہو چکا ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے کہنا ہے کہ میں کسی حد تک زندہ آدمی ہوں اور غلطی سے یہاں وجود ہوں کہ یہ برج غلطی سے میرے گرد تعمیر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے امید کرتا ہوں کہ آپ خداوند مجھے اب چیخنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

(ایک آدمی کی چیخ، اس کے بعد سناٹا)

سید محمد خاں

ان تحریروں کا نیا مجموعہ

برجِ خموشاں

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

محمد خالد اختر

کراچی کا تہذیبی مرقع مع مدد نامہ بے نظیر

یہ داستان حال پریشان خیال شہر چالِ بدیع الجمال وغیرہ سراپا سمر محمد خالد خان اختر مقیم حال رحمت بے نظیر دل پذیر رشکِ پیرس و لندن، مسکن ماہ وشان گل بدن و جوانان سیم تن حامی مردم شہر باشندے یہاں کے کیا مہاجر کیا انصار، ہمتہ قومیت میں سرشار، جہاں آفت کے پرکالے سب ہیں و فہیم ہر کوئی اپنے رنگ میں مست۔ اکثر مطلب پر مستعد دیدہ مصاف میں شہر کو دیکھیں تو سکون و عافیت سے منہ سر لپیٹ بستر میں پڑا رہے گھر سے باہر نہ جائے، کمائی نہ کھائے۔

سبحان اللہ عجب شہرِ خلفشار ہے دھواں دھار ہے۔ یہاں کے جیسے محلّے ہیں ویسے لاہور اور ملتان کے شہر ہیں۔ ڈیفنس صدر بندر روڈ بوہری بازار چاکی واڑا بہار کالونی لیاری، ناظم آباد ڈلو کھیت، مالیر ماڈل کالونی گلشنِ اقبال، طارق روڈ، کب تک یہ بندہ در دہان ان محلوں کے نام گنوانے پہ سعی فضول ہے زبان بار جائے شمار تمام نہ ہو پائے۔ ہر ایک محلہ بڑے شہر جیسوں ملک پھیلاؤ۔ ہر ایک کا تمدن جدا فن تعمیر الگ منفرد جمعیتی پٹھوں، خونیوں، کلاشنکوفوں سے لیس چھوکروں کی اکثر ان قصبات کے کوچوں میں نمودار ہوتی ہیں اور کاروبار ٹھپ کرتی ہیں۔ کوہرام شہر کے آدمی تماشا دیکھتے ہیں۔ نزدیک نہیں پھٹکتے حتیٰ کہ ملاؤں کے علاقے زیرِ کوتوال آتے ہیں، حکومت کی فوج کی لشکری گشت کرتی ہیں۔

ڈیفنس کا علاقہ پچاس ساٹھ مربع میل پر محیط ہے۔ فرشتے اس کا نقشہ دیکھیں تو گلزار جنت کو دل سے محو کریں۔ ہم ہاری سالی کی خدمت میں ہر دن گئی ہوں کہ یہاں آباد ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ کوٹھیاں خوش نما، جان فزا، فردوس کے محل نہ ان پر نثار کھلے ہوئے ہر کوٹھی محض سر پھاٹک پر باوردی دربان ایستادہ، اندر احاطے میں پانچ پانچ چھ چھ موٹر ایک صاحب خانہ کی، ایک بڑی بیگم کی، ایک چھوٹی بیگم کی، ایک بیٹی کی، ایک بیٹے کی۔ اس شہر کے اہلِ دول کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ کاروں دیکھیے تو شرم سے پانی پانی ہو جائے ان میں سے

Scanned with CamScanner

عروش کے سپارے اور بعض جدی پشتی بادشاہ زادے یہ لوگ اکثر رعونت اور غوا کنندگان کے خوف سے پھاٹک بند رکھتے ہیں۔

یہاں کا ہر شخص کیا امیر کیا فقیر، اپنی حیثیت کے مطابق خوش لباس، خوش خوراک ہے فقیر عموماً جبہ و سرپیچ سر پر لگائے ہیں گردن میں منکوں کی مالا اس پر تھگلیوں کی رنگین خلعت پہنے ہوئے ہیں ہاتھ میں کشکول کو سکوں اور نوٹوں سے بھرے ہیں۔ بازار میں شلوار قمیص میں سر پر ٹوپی اور فرنگی پائجامہ میں جیسے اور باوضع نظر آتے ہیں۔ یہاں کے جو مزدور مسکین ہیں دوسرے شہروں کے ویسے امیر ہیں۔ ہر فن میں باکمال یہاں موجود ہے ایسے استاد فن کہیں دیکھنے میں نہ آئے۔ اس فقیر کے ایک مہمان لاہور کا ٹکٹ جہازوں کے سٹیشن پر لینے کو گئے۔ کھڑکی کی قطار میں کھڑے ہوئے۔ کھڑکی پر پہنچ کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو یہ معلوم ہوا۔ بڑے صاحب کسی استاد نے اس صفائی سے جیب کاٹی تھی کہ ہنسی ہنسی کر اپنے روپے جانے کا قلق کم نہ کیا۔ مجھ سے چار سو روپے ادھار لے کر یہ سیر پہنچے۔ ایک مدت سے نامہ و پیام ان کی طرف سے نہیں آیا۔ غالباً جیتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

کلفٹن روڈ کا دورویہ بازار کس شان کا ہے، ہر عمارت ہر دکان کا پیش آن بان کا ہے۔ فلک بوس محل سر زر کے بیچوں بیچ موٹر کاروں کا جلوس عجب طمطراق سے رواں دواں ہے گویا مختلف سمتوں میں ساتھ ساتھ بہتے دو لہراتے مرجیں مارتے دریا ہیں جو تھمتے میں نہیں آتے جو کوئی دو سرے کنارے جانے کی خاطر ان کو عبور کرنے کی ہمت دل میں لائے سیدھا اگلے جہان کو جائے ہمیشہ کے لیے اس شہر سے ہجرت فرمائے۔ پیر مرد و زن مختل حواس کے لیے درحقیقت اس بحر کو پیراکی خطرناک ہے پانچ چھ بوڑھے ہر روز اس کی نذر ہوتے ہیں خالق حقیقی سے معانقہ کرتے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف پر پتھر اور کنکریٹ کے فٹ پاتھ ہیں جا بجا ٹوٹے شکستہ بیچ میں ڈھکن کے سیور میں ہول اس میں پاؤں پڑے تو تحت الثریٰ کی خبر لائے کوئی سراغ نہ پائے۔ اس پاس کوڑے کباڑ کے مرصت بخش منظر ابھار ہیں تین تلواروں کے چوک سے سو راہ سپر مارکیٹ پر وسیع گول چکر، ارد گرد عالی شان سٹور اور دکانیں ہیں کل جہان کا سامان سرمایۂ زینت و زیبائش ان میں سجا ہے۔ اندر روک ٹوک نہیں، گو گماشتے عام آنے جانے والے بازاریوں کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ قطار در قطار فروخت کا ہر سامان جو لباس میں کسی کے آئے سجا ہے۔ قیمت ہر چیز کی اس پر درج جس کی جس شے پر جی آئے اس کو ایک پہیوں والی ٹرالی میں ڈالتے جائے ٹرالی کو کاؤنٹر پر لے آئے اور حساب چکائے۔ لاکھوں کی خریداری یہاں ہر روز ان سٹوروں پر ہوتی ہے مفلس جنہ وہاں نہ گھسے ان سرمایہ‌‌ عیش کو سپنا سمجھیں آنکھیں بند کریں۔

طرب کو ہوٹنگ بیسن کی دورویہ سڑک، فلک بوس اٹھ اٹھ منزلہ محل سرائیں سب ادھر نیچے دکانیں اسٹور اور طعام خانے۔ ایک بازار یہاں ویڈیو کی دکانوں کا ہے جہاں جیوں کی سب فلمیں یہاں دستیاب ہیں۔ گو کہ ہندوستانی فلموں کا دیکھنا جرم ہے، مگر سب دیکھتے ہیں۔ محافظین قانون مناسب معاوضہ لے کر چشم پوشی کرتے ہیں۔ کھلم کھلا اس دھڑلے سے کاروبار ہوتا ہے سبحان اللہ عجب میلا لگا ہے، پورس کی شانز الیزے اس کے سامنے گرد ہے۔

مزدوروں موٹر کاروں کا ہجوم ان میں مارچنان پرفی مسافر عارف دنیا و دین جو کوئی ان کو کھڑی دو گھڑی ٹک ٹکٹکی باندھ کر دیکھ لے اول تو عش کرے ورنہ محبوبہ چشم پیشہ کی صورت ہمیشہ کے لیے اس کے سینے پر نقش ہو ایسا روگ لگے کہ عمر بھر کے لیے کسی کام کا نہ رہے مٹھائی اور طعام کھیر رنگ رنگ کے سی گل مستر موگر پیرا تاورہ شیر مال، مرغ بریاں، چکن کڑاہی، زعفرانی پلاؤ، جھینگا مچھلی کل جہان کی نعمت اب تذرو کی جس کی بو باس سے باہر صدائیں بھوکوں کی بھوک ہے سونگھ کر دو دن تک بھوک نہ لگے۔ دام مناسب مناسب۔ ایک چھوٹی دکانیں کے پچاس ساٹھ روپیہ ایک بار اس کا چٹخارہ لے کر پھر ادھر کا رخ نہ کرے۔ بازاری خوش سلیقہ نوکرے خدمت پر مستعد۔ ویسے تو بوہری مارکیٹ والے خان کا کباب پراٹھا بھی مشہور ہے۔ مگر پیزا کارنر والے کے پیڑے کا اور ہی سرور ہے چار دن عطر پھر ڈکاریں آتی رہیں۔

ایک شام بندے نے بھی یہ پیڑے کی نعمت چکھی تھی۔ احباب کے لطائف میں اس نے عجب لطف دیا۔ چار قازی والے سارنگیوں نے اپنی ساری پر دھنیں بجا کر لطف کو دوبالا کیا۔ سیر کی مدہوش سے نہ نیازہ بل کا حساب کتاب میری ایک بھتیجی نے چکایا۔

یہی میلے ٹھیلے زیب النساء سٹریٹ اور طارق روڈ پر ہیں۔ سوداگر بیچے ان محلوں کے جواہرات میں تلتے ہیں۔ بوہری بازار میں خوب بیوپار ہوتا ہے۔ وہاں کے دکاندار مرہم علاج سوائج اور مہمان مرد گاہک کی کڑک کولا و سل اپ سے تواضع کرتے ہیں، اصل تجارت جتنے میں سو ماتگی قیمت پاتی ہیں۔

بیچ کے پانی کی قلت ہوتی ہے، اس کی نوشی گھماتے سے ختت ہوتی ہے۔ محکمۂ آب رسانی کا اس میں قصور نہیں کہ ندی دریا کے اتار چڑھاؤ پر کمی و بیشی آب کا انحصار ہے۔ اس آب مصفا کی طہارت پر گنگاجل کو ناز ہے اب رود نیل اس کی مرمت پر نثار ہے۔ یہاں یہ پانی سفر طویل طے کرتا ہر راہ کی بدروؤں کے لطیف ذرات کو سمیٹتا بندگان شہر تک بار پاتا ہے جس سے یہ بیماری پیچش دائمی کا سبب ہے اس مرض کا علاج حکیم سقراط کے پاس نہیں، یہاں کے اطبائے نامدار کی مسیحائی کچھ ماہر نہیں دکھاتی، ناسور معدہ و امعا کے ٹھیک نہیں ہوتی۔

برسات کا اگر موسم ہے شہر کا یہ عالم ہے ادھر در چھینٹے ابر رحمت کے برسے، ادھر سب گلی کوچے رستے جل تھل ہوئے سارا شہر رہ آب۔ فقیروں غریبوں کی جھگیں غرقاب ہوئیں۔

برکھا کی برکت، اللہ اکبر

دو انچ بارش، جل جل پانی

کرسٹ بچو کی یہ ایسا عجب کھایا، گھسوں بلکہ دنوں تک نہ آیا جن کو مثل بندے کے سواری کا مقدور نہیں دخل کیا کہ کہیں آ جا سکیں گلی میں نکلیں تو پھسلے، چاروں شانے چت ہوئے ایدھی کی سوروکر ہو جو ان کو اٹھا کر لے جائے۔ ایسے میں لازم ہے کہ گھر کے اندر پڑے رہیں جیسے طائر قفس میں۔ اسکیں نہ جا سکیں، اور جو جمعت بچی آ گری ہو اللہ حافظ و ناصر سوجھی اکتیاں رحم میں مہمانوں سے پھر ملاقات حاشیہ پہلے پکے گھر کا انتظام عمل میں لائیں ورنہ ملتوی کریں۔

Scanned with CamScanner

ہر چند سب لوگ یہاں کے [illegible] ہیں، بعض سراپا [illegible] و شائستہ ہیں یعنی کہ ملک و قوم کی [illegible] لاہور و ملتان [illegible] شہروں میں شاعری [illegible] موسیقی مصوری [illegible] اس شہر [illegible] کی شاگردی [illegible] چند سال [illegible] شاعری حضرت رئیس امروہوی [illegible] قطع اور [illegible] قطعات لکھیں کہ بعد ان کے [illegible] اخبار جنگ میں چھپتی ہیں، [illegible] چار برس کا سرمایہ ابھی باقی ہے۔ [illegible] حضرت [illegible] کبیر و بلھے شاہ [illegible] تسلیم کیا۔ [illegible] مقدمہ [illegible] وغیرہ میں اپنی جودت طبع [illegible] جنگ اخبار میں [illegible] کا معاشرتی و سیاسی [illegible] چھوڑ [illegible] ہیں۔ [illegible] خوش مشرب [illegible] آتا ہے۔

انشا پردازی اور محققوں میں حضرت مشفق خواجہ، خوش طبع [illegible] خوش گفتار [illegible] لارڈ میکالے و حافظ محمود شیرانی [illegible] قلم کو عام کرنے [illegible] کام [illegible] تحریر کرتے ہیں [illegible] اس طور [illegible] ہیں کہ [illegible] دشمن کا [illegible] ان کی [illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible] اب کام کا ذمہ [illegible] کی قوت بھری ہے۔ [illegible] چالیس برس [illegible] ایک ماہ نامہ [illegible] جاری فرمایا [illegible] یہ ماہتاب علم و ادب [illegible] طلوع ہوتا ہے اور کبھی [illegible] ہوتی۔ یہ اعزاز اس سلطنت میں اردو یا کسی زبان کے پرچے کو حاصل نہ ہوا۔

[illegible] کے مشفق [illegible] اس شہر میں اور [illegible] ہیں، ان کی صفات کے بیان کے لیے دفتر درکار ہیں۔ [illegible] طبیعت [illegible] مختصر ہے جس کسی کا نام چھوٹ جائے گا [illegible] کر لے گا۔

ایک انجمن امیر [illegible] کی اس شہر میں [illegible] کے نام سے قائم ہے۔ ہر کوئی اپنے گھر سے ایک [illegible] مہربان کے گھر پر [illegible] ہیں۔ [illegible] مذاق کی گفتگو لطیفہ گوئی سے دل خوش کرتے ہیں۔ [illegible] ہیں اور [illegible] ہیں۔ پھر ہر کوئی اپنا [illegible] کو

[illegible] میں [illegible] گھر چلا جاتا ہے۔ کوئی [illegible] روزگار [illegible] داستان گو یا شاعر ان محفلوں میں راہ نہیں پا سکتا۔

ہر طبیب اس شہر کا اپنے دور کا مسیحا ہے [illegible] بشرطیکہ مریض دیر سے ان کے پاس نہ پہنچے [illegible] قلب کے ماہر معالج موجود ہیں۔ [illegible] ان کے علاج کے بعد [illegible] کو سننے [illegible] کو بولنے اندھوں کو دیکھنے اپاہجوں کو اپنی ٹانگوں پر چلتے دیکھا ہے۔ یہ طبیب [illegible] کرتے ہیں اور اپنی تجربے [illegible] ہیں۔ خدمت خلق کا نام ان کے دم سے زندہ ہے ورنہ ہر کوئی یہاں [illegible] کا بندہ ہے۔ [illegible] کے ایک حبیب کو [illegible] عارضہ ہوا [illegible] کا مشورہ دیں وہ نہ مانے۔ طبیب [illegible] علاج [illegible] ڈیڑھ ہزار روپے کا صرف [illegible] کرنے کے بعد پانچ دن کے اندر بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔

اس شہر میں بیسیوں مکتب، درس گاہیں، جامعات ہیں۔ ان کے فیض سے ہر طالب علم [illegible] و کلاشنکوف صحیح نشانے پر چلانے کی مہارت بہم پہنچاتا ہے۔ علوم حرب و ضرب میں طاق ہو جاتا ہے۔ درس و تدریس برس میں دو تین مہینے ہوتی ہے اور پانچ چھ سال کا نصاب پڑھانے میں کم و بیش دس سال لگ جاتے ہیں۔ ان درس گاہوں اور جامعات کی دیواروں پر مختلف جماعتوں کے نعروں کی خوش نویسی سے [illegible] باغ باغ ہو جاتا ہے۔ [illegible] رقم [illegible] ہے۔ ہر جامعہ میں دو تین [illegible] ہے۔ حاجی عبد الستار ایدھی کا جنازہ اٹھانے کا انتظام معقول ہے۔

[illegible] شریف کلاونت [illegible] موسیقی نے مشرق و مغرب میں دھوم مچائی، [illegible] انگلستان میں، [illegible] ہوا [illegible] میں شامل ہونے سے [illegible] آپریشن کرانا [illegible] ادا سے وہ قیامت برپا کی کہ [illegible] ہاروت و ماروت اپنی [illegible] کراچی کے [illegible] اسپتال میں [illegible] محمد شفیع [illegible] شاہ کے ناٹک [illegible] میں ایک مشہور جاگیردار سیاست دان کا [illegible] کہ حقیقت کو [illegible] اس کی اداکاری دیکھ کر [illegible] اگلے جہان کو ہجرت کی [illegible] ناٹک میں [illegible] منصور کی اداکاری بھی اچھی ہے، جس نے دیکھی تعریف کی۔

اس شہر شریف میں [illegible] کے مزار و مقابر بھی جگہ جگہ پر ہیں۔ ملائک عرش سے فرش پر اتر کر [illegible] درود خوانی کرتے ہیں۔ حضرت بابائے قوم قائد اعظم محمد علی صاحب جناح کا مزار ایک وسیع احاطے میں [illegible] ہے۔ [illegible] سنگ مرمر کی تعمیر ہے [illegible] مکعب پر [illegible] والی شیخ اس شہر کو اپنی [illegible] سرفراز کرتا ہے۔ سب سے پہلے [illegible] اس مزار پر [illegible] آتے ہیں۔ وہ [illegible] و چوبند

بحری فوج کے جوانوں کی مدد سے قبر پر پھول چڑھاتے ہیں۔ دوسرے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ حضرت [illegible] بظاہر مردہ پر حقیقت میں زندہ ہیں۔ [illegible] والوں کا حال [illegible] خوب خوب جانتے ہیں۔ دیکھتے ہیں [illegible] کچھ نہیں۔ حضرت سید عبد اللہ شاہ غازی کا مزار منور [illegible] روشنیوں سے جگمگ کرتا ہے اور ہر دم مرجع خلائق ہے۔ کسی کو [illegible] نہیں ہوتی۔ حضرت منگھو شاہ کا مزار کراچی سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت کو مگرمچھ پالنے کا شوق تھا۔ جو [illegible] کو گوشت کھلاتے ہیں اپنی مراد پاتے ہیں۔ پیر کے چشموں کے گرم پانی سے بہت سے مریض، مفلوج، اپاہج تندرست ہو گئے۔ بندہ کس کس کا ذکر کرے قلم کو یارا نہیں کہ ان بزرگوں کی سب کرامات رقم کرے۔

کھدر کے [illegible] مرقع اعلیٰ، خوش پوش، لنگوٹی دھوتی یا جامہ بدن پر، سگریٹ [illegible] نہیں لگاتے [illegible] ہیں۔ ایک ایک ڈیڑھ دو کروڑ کی اسامی ہے اغوا کرنے والے [illegible] اس محلے کا رخ نہیں کیا۔ [illegible] کسی دن [illegible] نہیں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

خانہ بگوش [illegible] مختصر کیا ہے۔ حاسدوں کو جلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ زیادہ لکھتا [illegible] کتاب ہو جاتی جسے کوئی نہ چھاپے [illegible] سمجھ میں [illegible] کہ لوگ کراچی شریف کے نام پر [illegible] لال پیلے کیوں ہوتے جاتے ہیں [illegible] کہ یہاں رہتے ہیں [illegible] کو بیان [illegible] آیا ہے۔

یہ مضمون مختصر [illegible] شہید [illegible] حضرت صدر [illegible] جنرل ضیا الحق صاحب [illegible] شروع [illegible] چند مکروہات [illegible] اس حد تک [illegible] سکون قلبی سے [illegible] نہ رہا۔ اس عرصے میں حضرت مرحوم و مغفور غازی اسلام ضیاء الحق [illegible] ہو گیا [illegible] لگ گیا۔ تاب و طاقت [illegible] پانچ چھ ماہ بعد جب محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ [illegible] نشین ہوئیں اور ملک اور سلطنت کی [illegible] سنبھالی [illegible] وقت وقت سے [illegible] مضمون کو جہاں سے چھوڑا تھا جاری کیا۔ [illegible] ہیں کہ ایسی [illegible] فصاحت و بلاغت سے پُر مضمون کا لکھنا [illegible] اللہ تعالیٰ کسی کی مشقت نہیں کھوتا۔

[illegible] اللہ [illegible] حوصلہ [illegible] بی بی [illegible] اول پر [illegible] کر چاروں طرف روشنی کر دی [illegible] میں بہار آ گئی۔ وہ [illegible] سے قفس میں پڑے [illegible] گونگوں کی [illegible] کوئی [illegible] لیے جیلوں کے دروازے کھل گئے

ہوئے اور لکھوکھہا [illegible] ہو گئیں [illegible] غازی مرحوم کے عہد میں یہ حال تھا شعر:

گھبرا کے آسماں کی طرف دیکھتی تھی خلق
جیسے خدا زمیں پہ موجود ہی نہیں تھا

ملک کے [illegible] دشمن جو اس سلطنت کو اپنی جاگیر [illegible] اور سابقہ حکومت کے پروردہ تھے وہ اس تخت پر [illegible] جھوٹ [illegible] اور حسب عادت [illegible] بی بی کے [illegible] میں بھی [illegible] میں مصروف ہوئے۔ [illegible] سے محروم [illegible] ریشہ دوانیوں کا [illegible] حاکم کے [illegible] قدم [illegible] ڈگمگاتا [illegible] کمینوں بدخواہوں کے خلاف تن تنہا سینہ سپر ہے۔ اللہ اسے اس دولت کی خاطر اپنی امان میں رکھے۔

[illegible] بی بی [illegible] اور سب گذشتہ [illegible] کی تمام کتاب [illegible] سے حروف غلط کی طرح مسترد کر دی ہیں۔ جب حکومت سنبھالی خزانہ تقریباً خالی تھا۔ مرحوم غازی کے [illegible] پانچ [illegible] کی ذمہ داری سے [illegible] دینے کا قصد [illegible] کچھ کہے حق بات یہ ہے کہ وہ [illegible] اور سلطنت کے [illegible] خواہ تھے [illegible] محترم کو صدر الصدور [illegible] مقرر کیا۔ [illegible] کہ سابقہ دور میں [illegible] وزرا [illegible] خورد برد ہوئے [illegible] حسنہ کے طور پر رقوم [illegible] ہضم کر گئے تھے [illegible] انکشاف [illegible] بے عزتی ہوتی ہے رقم ادا [illegible] انکار نہیں کیا۔ [illegible] عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

محترمہ بی بی کو [illegible] اعظم [illegible] نے اپنی بہن بتایا ہے۔ [illegible] دولت اسلام میں تشریف لائیں۔ محترمہ بی بی نے سب ملکوں کے دورے کیے اور ہر جگہ اپنی شرافت [illegible] جرأت کی دھاک بٹھائی۔ [illegible] اسلام کا وقار [illegible] بلند کیا۔ دشمن [illegible] زبان [illegible] دوسروں کی خوشحالی نہیں دیکھ سکتے [illegible] برادری [illegible] ریل کی کھڑکیاں [illegible] اکھاڑ دیں۔ گلچھرے اڑائے۔ ملک رہے نہ رہے ان کو اس سے کیا، ان کی جاگیریں کارخانے سلامت۔

ہر چند کہ غم روزگار آدمی کے ساتھ لگا ہے [illegible] خوش و خرم ہیں۔ حسن صورت و سیرت، ہمت و فراست و شرافت [illegible] دنیا کی خوبیاں ہیں [illegible] سب محترمہ پر [illegible] کر دی ہیں [illegible] اہمیت [illegible] بدنصیب [illegible] کہ ایسا دور اس ملک میں پھر نہیں آئے گا۔ شعر

Scanned with CamScanner

ڈونلڈ بارتھیم

غبارہ

غبارے کے پھیلنے کا آغاز ... چودہ ... پر ایک مقام سے ہوا جس کی صحیح محلِ وقوع کا راز میں آشکار نہیں کر سکتا۔ اس رات، جب لوگ محوِ خواب تھے، غبارہ شمال کی اور پھیلا، یہاں تک کہ وہ پارک تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے اس کو روک لیا۔ پو پھٹنے تک اس کے شمالی سرے پلازہ کے اوپر چھا چکے تھے۔ فضا میں آزادانہ لٹکا ہوا وہ دھیمے دھیمے ڈول رہا تھا۔ اس کے اوپر اٹھنے کے عمل میں جب کوئی [illegible] درختوں [illegible] تو مجھے [illegible] ہلکی سی مکدر ہوئی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ غبارے کو فضا میں بلند ہونے سے روکا جاتا۔ میں نے انجینئروں سے کہا کہ وہ غبارے کو فضا میں مزید بلند ہونے دیں۔ غبارے کا پھیلاؤ صبح تک جاری رہا۔ والو میں گیس مدھم سرگوشیوں میں داخل ہوتی رہی۔ غبارے نے شمالاً جنوباً پینتالیس بلاک، شرقاً غرباً بےترتیب علاقہ اور ایونیو کے دونوں اطراف قریب چھ بلاک اپنی لپیٹ میں لے لیے تھے۔ تو یہ صورتِ حال تھی اس وقت۔

لیکن "صورتِ حال" کہنا غلط ہے۔ اس سے مخصوص "حالات" کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ "حالات" جن کا کوئی حل ہوتا ہے۔ "حالات" جن [illegible] کردہ تناؤ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں تو ایسی کوئی صورتِ حال نہ تھی، کوئی ایسے "حالات" نہ تھے۔ بس ایک غبارہ تھا جو فضا میں معلق تھا۔ دھیمے بوجھل خاکستری اور بادامی رنگوں میں ڈوبا ہوا [illegible] غبارے کی سطح کھردری اور [illegible] تھی [illegible] طور پر [illegible] کی گئی تھی۔ [illegible] اس کیفیت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ غبارے کے بیچ ترتیب سے رکھے ہوئے پھسلتے ہوئے باٹوں نے اس وسیع پھیلاؤ کو کئی مقامات سے تھام رکھا تھا۔ یوں تو [illegible] اہم سنگِ میلوں سے بھری پڑی ہے لیکن اس لمحے وہاں صرف یہ غبارہ تھا، ٹھوس، قطعی، معلق۔

جو روشنی کے ظہور سے [illegible] جدا کہاں ہے
چراغ کے سامنے ہی چراغ جیسی ہو

[illegible] زندگی سے وفا کی۔

اردو کے منفرد ادیب

محمد خالد اختر

کی [illegible]

بیس سو گیارہ

کا نیا ایڈیشن بہت جلد شائع ہو رہا ہے

محمد خالد اختر

کی کہانیوں کا انتخاب

لالٹین اور دوسری کہانیاں

جلد شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

[illegible] ردعمل [illegible] چند لوگوں [illegible] دلچسپ [illegible] یہ ردعمل [illegible] و
حرص وہوس کو عکاسی کرتے تھے گو کہ دیوانگی اور فکر و اندیشے کی عدم موجودگی کی بنا پر اس کو یقیناً ایک پُرسکون اور پختہ ردعمل کہا جاسکتا ہے۔ شروع میں لوگوں کے درمیان غبارے کے معنی پر کچھ بحث ہوتی رہی لیکن تھم گئی۔ کیونکہ ہم نے مقصد کو جاننے کی کوشش کے بغیر جینا سیکھ لیا ہے اور اب تو معنی کی جستجو خال خال ہی رہ گئی ہے، سوائے ان مظاہر کے جو انتہائی سادہ اور بہتی ہوئی ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ غبارے کے معنی حتمی طور پر معلوم نہیں ہو سکتے لہٰذا اس پر طویل بحثوں میں الجھنا فضول ہے یا کم از کم [illegible] لوگوں کی [illegible] کو بیروں میں [illegible] عمر تصور [illegible] بھی دستیابی کا اعلان کرتے ہیں۔

چند کھلنڈرے بچے اچھل اچھل کر غبارے کو اس جگہ سے چھو لینے کی کوشش کر رہے تھے جہاں غبارہ عمارت کی سطح کے بالکل قریب تھا۔ یہاں تک کہ غبارے اور عمارت میں چند انچ کا [illegible] دوسری [illegible] ڈھلوان سطح پر دوڑ کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ ایک لمبی سی [illegible] سکتے تھے یا اگر آپ کا دل چاہتا تو لڑھک سکتے تھے۔ غبارے کی ان مختلف حرکات کی یہ مکانات بچوں کے لئے کافی سنسنی خیز تھے۔ کیونکہ وہ شہر کی سمت اور ہموار سطح کی عادی تھے لیکن غبارے کا مقصد بچوں کی تفریح طبع نہ تھا۔

ان لوگوں کی تعداد، بچے اور بڑے سب ملا کر، جنہوں نے غبارے کی سطح پر حرکات کے ان مواقع کا فائدہ اٹھایا اتنی زیادہ نہ تھی جتنا کہ ہو سکتی تھی۔ ایک خاص قسم کی ججھک، غبارے پر عدم اعتماد اس کے علاوہ غبارے سے ایک طرح کا بیر۔ کیونکہ ہم نے وہ پیپ چھپا دیے [illegible] ہوا سے بھری گئی تھی اور پھر [illegible] زیادہ تھی نہ مقام داخلہ کی مقام کا کھوج نہ لگا سکے تھے، یعنی اس مقام کا جہاں سے غبارے میں گیس بھری گئی تھی۔ شہر کی حکام، جن کے دائرہ کار میں اس غبارے کا ظہور ہوا تھا، جھنجلاہٹ کا شکار تھے۔ غبارے کی بے مقصدیت نے انہیں بے چینی میں ڈال دیا تھا (اور پھر یہ امر کہ وہ وہاں موجود تھا!) [illegible] اس کی تعمیر کی [illegible] ہیں کہ [illegible]" یا "الہام، فیصد زیادہ کارگر" تو یہ پریشانی پیدا نہ ہوتی لیکن تھی غبارے پر اس قسم کی کوئی چیز لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجموعی طور پر حکام کافی مشکل میں گو کہ یہ برداشت دو وجوہات کی بنا پر پیدا ہوتی تھی۔ اول تو یہ کہ رات کو خفیہ ٹیسٹ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ غبارے کو نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی برباد کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ عام شہریوں میں غبارے کی بہ کافی گرم جوشی پائی جاتی تھی۔
جس طرح ایک غبارہ تمام غباروں کی بارہ میں زندگی بھر کی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے، اسی

طرح ہر شہری کا غبارے پر ردعمل دراصل چند پیچیدہ رویّوں کا عکاس تھا۔ ہو سکتا تھا ایک شخص کے ذہن میں غبارے کا تصور آلودگی سے وابستہ ہو، جیسا کہ اس جملے سے اظہار ہوتا ہے [illegible] وسیع غبارے نے میں [illegible] شہر کی [illegible] کو آلودہ کر [illegible] شخص کے خیال میں غبارہ ایک طرح کی عبارت تھی جو لوگوں اور ان کے "آسمان" کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ لیکن درحقیقت [illegible] ایک [illegible] ہو رہا تھا۔ وہ آسمان ایسے نہ تھا کہ آپ کا دل چاہے کبھی زمین پر لیٹ کر مسرّت سے اس کو تکیں۔

غبارے کا اندرونی حصّہ دل فریب تھا۔ اس کی بوجھل، سلیٹی اور خاکستری رنگ دلفریبی اور بعض ملائم شکنوں میں ابھر رہی تھی۔ [illegible] کہ وہ شخص "آلودگی" کے بارے میں سوچ سکتا تھا [illegible] ایک پرلطف [illegible] کی آمیزش ہوئی۔ ایسا [illegible] جو اس کو پہلے خیال سے دست و گریباں ہو رہا ہوتا۔

دوسرے شخص کے لیے غبارے کا ظہور ایک غیرمتوقع انعام کی مانند ہو سکتا تھا۔ مثلاً آپ کے [illegible] کے کمرے میں داخل ہو کر [illegible] تمہارے لئے رکھ دیں [illegible] جس [illegible] گلدان میں لگے پھولوں کو [illegible] سمجھتی ہوں اگر تم [illegible] پھولوں کو [illegible] شاید [illegible] اس شخص کا یہ غبارہ ایک شاندار اور جرأت آمیز تجربہ تھا گو کہ ایسا تجربہ جس کو صحیح طور پر سمجھا نہ گیا ہو۔

ایک اور شخص کہہ سکتا تھا "[illegible] کی مثال کے بغیر شبہ ہے کہ [illegible] موجودہ صورت میں پایا جاتا" [illegible] لوگ اس سے متفق ہوئے اور بہت سے لوگوں کو اس کی بات سے اختلاف ہو سکتا تھا۔ "پیپ" اور "مثلاً" "صورت" اور "دیدہ زیب" جیسی بصیرت افروز مضامین متعارف ہوئے۔ کچھ لوگ عورتیں محبتوں کے [illegible] میں مصروف ہو گئیں خیالات جن کا تعلق غبارے میں خود کو گم کر دینے یا [illegible] کی [illegible] کا [illegible] انسانی شخصیات کی نجاتی عمیق [illegible] لہٰذا ان خواہشات کا برملا اظہار نہ ہو پایا۔ لیکن اس بات کے شواہد موجود تھے کہ یہ خواہشات عام تھیں۔ اس پر بھی بحث ہوئی کہ آپ غبارے کے نیچے کھڑے ہو کر جو محسوس کرتے [illegible] اس احساس کو خاص اہمیت تھی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ غبارے کے نیچے [illegible] کو ایسے لوگوں کا احساس ہوا جو نہیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جبکہ غبارے کے دشمنوں نے ایک طرح کی جھنجھلاہٹ اور جھگڑے کی سی کیفیت کا اظہار کیا۔ [illegible] پیدا جاتا تھا "[illegible]"، "بوجھ" "روحانی مسرت" "بڑے جوڑ توڑ کرنے" "تاریک [illegible] کچھ متضاد" "دقیانوسی شخصیت جو اب تک غباروں کے شعوب پر حاوی ہے" "غیر معمولی قوت" "نرم گرم خوابیدہ گرگابیاں" "کیا وحدت کو رسمیت پر قربان کر دیا گیا ہے؟" "تباہی کا پیش خیمہ" "پھیلتا ہوا"۔

لوگوں نے ایک خاص طریقے سے غبارے کے ذریعے معاملات کو طے کرنا شروع کر دیا۔ "[illegible] کے حصوں وہ [illegible] سٹریٹ پر جب چاہو تک مر [illegible] آلامو چلی ہاؤس کی سڑک" [illegible] کے [illegible] کمرے میں تارے ہو کہاں؟ سخت چیلی اور ابھی تو سکتے ہیں

جہاں پر یہ مرادین اوٹ گیارہ کے چھجے سے کسی ھولی کمان کی طرح لٹکا ہوا ہے۔"

جب ایک سطح اوپر سے دیکھا جائے تو اس میں زمین سے اوپر ہو ... ، متعلقات پر وقتی دور پر واسطے سے ٹیول جاتی تھی، "گرم گرم، خوابیدہ گرگاھوں" کے علاوہ لیکن اسے "اضافی رہ" کہنا غلط ہے یہ ہوا اپنی جگہ ضم تھی اور نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ کبھی ہوا پر ... ہے ... انسانی سے ... اور کہیں عمارے کی ضرورت سے

خیال تھا کہ غبارے کا جو پہلو پسند کیا گیا وہ اس کی لاشناخت تھی۔ اس کی حدیں متعین نہ ہیں ... کوئی پھولا ہوا ... جیسے کوئی ... اور دنیا کی جانب نکل جاتا، جیسا کہ فوج کی حرکت میدانِ جنگ سے دور ہیلکوارٹر میں نقشے پر نظر آتی ہے پھر وہ حصہ دوبارہ اپنی جگہ ... جاتا گویا کہ اسے واپس دھکیل دیا گیا ہو یا پھر وہ حصہ ایک نئی ... میں ... جگہ ... کسی سمت ... ہو جاتا ہوتا غبارے کی یہ ماہیت، اپنی ماہیت بدلتا ہوا، لوگوں کے لیے بےحد حوصلہ کن تھی، کیونکہ ان کی اپنی ... میں ... وہ ... کی ... سی کو وہ پا نہ سکتی تھی۔

بالمقابل ان ہمارے ... کنکریٹ کی ہٹ پاتھ پر بنے ہوئے لکھی ڈریکسان مستطیلی برعکس، غبارے کا بےترتیب وجود ذات کی گمشدگی کا امکان پیش کرتی لگا۔ مشینوں کی ... مخصوص ترتیب ... اور طویل سپردگی کی ضرورت کے ... بڑھتا جا رہا ہے جیسے جیسے یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ ایک الجھانے والی عدم ماہیت کی بنا پر ان جوابات کی طرف مائل ہو رہے ہیں جن کا ایک نمونہ وہ غبارہ تھا۔

جب ہم دوبارہ سے واپس آئیں تو میں نے تم سے غبارے کی شبیہ ملا۔ تم نے پوچھا کہ وہ میرا ہے، میں نے اثبات میں جواب دیا "غبارہ"، میں نے کہا، "فطری خودسرشت کا ایک مظہر ہے اور اس اضطراب اور جنسی محرومی، کا آئینہ دار جو میں نے تمہاری عدم موجودگی میں محسوس کی۔ جبکہ تم ہیوگی سے واپس آ چکی ہو، نہ اس کی ضرورت باقی رہی ہے اور نہ ہی یہ موزوں لگتا ہے۔"

غبارے کو ہٹانا آسان تھا، ٹیم و شجیم اور ٹبے ٹرک ہوا نکلے ہوئے غبارے کو لاد کر لے گئے یہ وہ مغربی ورجینیا کے ایک گودام میں پڑا کسی غمگین لمحے کا منتظر ہے، شاید ایسا لمحہ جب ہم ایک دوسرے سے خفا ہوں۔

انگریزی سے ترجمہ: زینت حسام

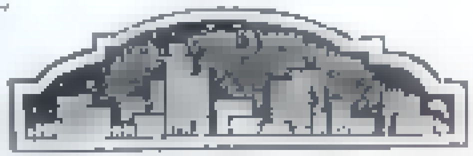

ولیم سیرویان

وہ آدمی جس کا دل پہاڑوں میں رہ گیا

سن انیس سو سولہ میں، جب میں پورے چھ سال کا بھی ہوا تھا، ایک بوڑھا شخص سان ونسنٹ ایونیو سے بگل پر اکیلے کا گیت گاتا ہوا اترا اور ہمارے مکان کے سامنے رک گیا۔ میں صحن سے دوڑ کر باہر نکلا اور جرکھٹ پر کھڑے ہو کر سن کے دوبارہ بگل پر گانے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس نے گیت نہیں گایا۔

میں نے کہا: "میں آپ کو دوسرا دھن بجاتے ہوئے سننا ضرور پسند کروں گا۔"

اس نے کہا: "نوجوان، کیا تم اس بوڑھے آدمی کے لیے ایک گلاس پانی لے آؤ گے جس کا دل یہاں نہیں بلکہ پہاڑوں میں ہے؟"

"کون سے پہاڑوں میں؟" میں نے کہا۔

"اسکاٹلستان کی پہاڑیاں۔" بوڑھے شخص نے کہا۔ "کیا تم پانی لا سکتے ہو؟"

"آپ کا دل اسکاٹلستان کی پہاڑیوں میں کیا کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا دل دکھ رہا ہے"، بوڑھے شخص نے کہا۔ "کیا تم میرے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا سکتے ہو؟"

"آپ کی والدہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"میری والدہ ٹلسا اوکلاہوما میں ہیں"، بوڑھے شخص نے کہا، "مگر ان کا دل وہاں نہیں ہے"

"ان کا دل کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اسکاٹلستان کی پہاڑیوں میں"، بوڑھے شخص نے کہا۔ "میں بہت پیاسا ہوں، نوجوان۔"

"بھلا کیسے آپ کے خاندان کے لوگ اپنے دل ہمیشہ پہاڑیوں میں چھوڑ آتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہم ایسے ہی لوگ ہیں"، بوڑھے شخص نے کہا۔ "آج یہاں ہیں اور کل کہیں اور۔۔۔"

"آج یہاں اور کل کہیں اور؟" میں نے کہا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ایک لمحہ میں زندہ اور اگلے میں ختم"، بوڑھے شخص نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"آپ کی والدہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا

"وہ ورسٹر میں ہیں، اسکاٹ لینڈ کے قصبے میں" بوڑھے شخص نے کہا "مگر ان کا دل وہاں ہے۔"

"کیا آپ کا دل بھی پہاڑیوں میں ہے؟" میں نے کہا۔

"بیٹے" بوڑھے شخص نے کہا "بیٹے، میں پیاس سے مر رہا ہوں۔"

برآمدے سے میرا باپ برآمد ہوا اور اس شخص کی طرح دکھائی دیا جو ابھی ابھی کسی دلآویز خواب سے جاگا ہو۔

"جونی" وہ گویا ہوا "بیچارے بوڑھے میاں کو ستانا بند کرو۔ اس سے پہلے کہ وہ گر کر دم توڑ دیں ان کے لیے پانی کا جگ لے آؤ۔ کیا تمہاری شائستگی کہیں کھو گئی ہے؟"

"کیا کوئی کسی مسافر سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا؟" میں نے کہا

"مسٹر میک گریگور کے لیے پانی لاؤ" میرے باپ نے کہا "خدا تمہیں غارت کرے۔ اب کاٹھ کے الو کی طرح کھڑے مت رہو۔ ان کے پینے کے لیے کچھ لاؤ اس سے پہلے کہ یہ گر کر دم توڑ دیں۔"

"آپ ان کو خود پانی لا دیں" میں نے کہا "آپ تو کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"کوئی کام نہیں کر رہا ہوں؟" میرے باپ نے کہا "کیوں جونی! تمہیں خوب معلوم ہے میں اپنے ذہن میں ایک نئی نظم ترتیب دے رہا ہوں۔"

"آپ نے کہاں سے جان لیا کہ مجھے معلوم ہے؟" میں نے کہا "آپ تو صرف برآمدے میں ننگے پیر [illegible] مجھے کیسے معلوم ہو؟"

"ٹھیک ہے۔ مگر تمہیں جاننا چاہیے" میرے باپ نے کہا۔

"گڈ مارننگ" بوڑھے شخص نے میرے باپ سے کہا "آپ کے صاحبزادے مجھے بتا رہے تھے کہ اس علاقے کا موسم کتنا خنک اور خوشگوار ہے۔"

"گڈ مارننگ" میرے باپ نے کہا "آپ اندر تشریف لا کر تھوڑا سا آرام کیوں نہیں کر لیتے؟ دوپہر کے کھانے سے پہلے کے لیے ہمارے گھر پر آپ کی موجودگی ہمارے لیے اعزاز کا باعث ہوگی۔"

"ضرور جناب" بوڑھے شخص نے کہا "میں فاقے سے ہوں۔"

"کیا آپ میرے لیے 'مجھے صرف اپنی آنکھوں سے پلاؤ' گا سکتے ہیں؟" میں نے بوڑھے شخص سے کہا "میں اس نغمے کو بگل پر ضرور سننا چاہوں گا۔ یہ میرا پسندیدہ گیت ہے۔ میرا خیال ہے میں اس گیت کو سب میں کسی بھی گیت سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

"بیٹے" بوڑھے شخص نے کہا "جب تم میری عمر کو پہنچو گے تب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ گیتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اصل چیز روٹی ہے۔"

"پھر بھی" میں نے کہا "میں اس گیت کو ضرور سننا چاہوں گا۔"

بوڑھا شخص برآمدے تک بڑھا اور اس نے میرے باپ سے ہاتھ ملایا۔ "میرا نام جیسپر میک گریگور ہے" اس نے کہا "میں اداکار ہوں۔"

"مجھے آپ سے متعارف ہو کر بے پایاں مسرت ہوئی۔" میرے باپ نے کہا "جونی، مسٹر میک گریگور کے لیے پانی کا جگ لاؤ۔"

میں کنویں تک گیا اور ایک برتن میں ٹھنڈا پانی بھر کر اسے بوڑھے شخص کے پاس لایا۔ اس نے پورا برتن ایک طویل گھونٹ میں پی لیا۔ پھر اس نے آسمان پر اور دور سان ہوزے ایونیو پر نظر ڈالی، جہاں سورج ڈوبنا شروع کر چکا تھا۔

"مجھے خیال آتا ہے کہ میں گھر سے پانچ ہزار میل دور ہوں" اس نے کہا "کیا آپ کے خیال میں ہم تھوڑی سی روٹی اور پنیر کھا سکتے ہیں تاکہ جسم اور جان کا رشتہ برقرار رہ سکے؟"

"جونی" میرے باپ نے کہا "دوڑ کر دکاندار کے پاس جاؤ اور فرانسیسی روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر لے آؤ۔"

"مجھے پیسے دیں" میں نے کہا۔

"مسٹر کوسک سے کہنا کہ وہ ہمیں ادھار دے دیں" میرے باپ نے کہا "میرے پاس ایک سینٹ بھی نہیں ہے جونی۔"

"وہ ہمیں ادھار نہیں دیں گے" میں نے کہا "وہ ہمیں ادھار دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ وہ ہم سے بیزار ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم نکمے ہیں اور بقایا ادا نہیں کرتے۔ ہمیں ان کے چالیس سینٹ ادا کرنے ہیں۔"

"جاؤ اور جا کر ان سے معاملہ طے کر لو" میرے باپ نے کہا "تم جانتے ہو تم یہ کیونکر کر سکتے ہو۔"

"وہ معقولات نہیں سنیں گے" میں نے کہا "مسٹر کوسک کہتے ہیں وہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں صرف اپنے چالیس سینٹ چاہییں۔"

"ان کے پاس جاؤ اور انہیں روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر دینے پر آمادہ کرو" میرے باپ نے کہا "جونی! تم یہ کام کر سکتے ہو۔"

"بیٹے! ان کے پاس جاؤ" بوڑھے شخص نے کہا "اور مسٹر کوسک سے کہو کہ وہ تمہیں روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر دے دیں۔"

"اب جاؤ جونی" میرے باپ نے کہا "تم کبھی اس دکان سے فتوحات کے بغیر باہر نہیں نکلے ہو۔ تم دس منٹ میں یہاں اس خوراک کے ساتھ واپس آ جاؤ گے جو بادشاہوں کو زیب دیتی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "مسٹر کوسک کہتے ہیں ہم ان کے ساتھ حرام خوری کر رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں ہم کس طرح کا کام کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ان سے جا کر کہہ دو" میرے باپ نے کہا "میں کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ میں شاعری لکھ رہا ہوں۔ مسٹر کوسک سے کہہ دو کہ میں دن رات شاعری لکھ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "مگر میرا خیال ہے وہ بہت زیادہ متاثر نہیں ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں آپ بھی دوسرے بے روزگار آدمیوں کی طرح گھر سے نکل کر کوئی کام کیوں نہیں تلاش کرتے۔ وہ کہتے ہیں آپ کاہل اور نالائق ہیں۔"

"جونی! تم جاؤ اور جا کر انہیں کہو کہ وہ فاترالعقل ہیں" میرے باپ نے کہا "تم جاؤ اور جا کر انہیں کہو کہ تمہارا باپ اس وقت کے عظیم ترین گمنام شاعروں میں سے ایک ہے۔"

Scanned with CamScanner

"وہ اس کی پروا نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر میں جا رہا ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ کیا گھر میں کچھ نہیں ہے؟"

"صرف بُھنی ہوئی مکئی کے دانے۔" میرے باپ نے کہا۔ "ہم مسلسل چار دنوں سے مکئی کے دانے کھا رہے ہیں جونی! ہمیں روٹی اور پنیر چاہیے۔ اگر تم مجھ سے اس طویل نظم کو مکمل کرنے کی توقع رکھتے ہو۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"دیر مت لگانا۔" مسٹر میک گریگر نے کہا۔ "میں گھر سے پانچ ہزار میل کے فاصلے پر ہوں۔"

"میں دوڑ کر جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں راستے میں کوئی رقم پڑی ہوئی مل جائے۔" میرے باپ نے کہا۔ "تو تمہیں یاد ہے نا، ہم آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔

میں مسٹر کوسک کی دکان تک دوڑتا ہوا گیا۔ مگر مجھے راستے میں کوئی رقم پڑی ہوئی نہیں ملی، ایک معمولی سکّہ بھی نہیں۔

میں دکان کے اندر داخل ہو گیا اور مسٹر کوسک نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔

"مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "اگر آپ چین میں ہوں اور دنیا میں آپ کا کوئی دوست نہ ہو اور نہ کوئی رقم آپ کے پاس ہو، کیا آپ کسی ایسے عیسائی کا دھیان تصور کریں گے جو آپ کو ایک پونڈ چاول دے دے؟ کیا آپ تصور کریں گے؟"

"تمہیں کیا چاہیے؟" مسٹر کوسک نے کہا۔

"میں یونہی تھوڑی سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ توقع کریں گے کہ آرمینی نسل کا کوئی شخص آپ کی مشکل کو تھوڑا سا حل کر دے۔ کیا آپ ایسی توقع نہیں کریں گے مسٹر کوسک؟"

"تم کتنے پیسے لائے ہو؟" مسٹر کوسک نے کہا۔

"یہ پیسوں کا معاملہ نہیں ہے مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "میں چین میں ہونے اور مسلّمہ قوم نسل سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔"

"مجھے کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" مسٹر کوسک نے کہا۔

"آپ کو چین میں اس طرح کیسا لگے گا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "میں چین جا کر کیا کروں گا؟"

"آپ وہاں مسافر ہوں گے، اور فاقہ زدہ، اور ساری دنیا میں کوئی آپ کا دوست نہیں ہو گا۔ آپ کسی چینی عیسائی سے یہ توقع تو نہیں رکھیں گے کہ وہ آپ کو چاول کا ایک پونڈ دیے بغیر رخصت کر دے، کیا آپ ایسی توقع رکھیں گے؟"

"میرا خیال ہے میں ایسا نہیں سوچوں گا۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "مگر تم چین میں نہیں ہو جونی اور نہ تمہارا باپ۔ تمہیں اور تمہارے باپ کو گھر سے باہر نکل کر اپنی زندگی میں تھوڑی دیر کے لیے کوئی کام کرنا چاہیے۔ تم تو ابھی شروع کر دو تو بہتر ہے۔ میں تمہیں ادھار پر مزید

کوئی خورد و نوش کی چیز نہیں دینے جا رہا۔ مجھے معلوم ہے تم پیسے کبھی ادا نہیں کرو گے۔"

"مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں چند اشیائے خورد و نوش کے بارے میں بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو چین میں آپ کے ارد گرد کے دیہی لوگوں کی بات کر رہا ہوں جہاں آپ فاقہ زدہ اور قریب المرگ ہیں۔"

"یہ چین نہیں ہے۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "تمہیں باہر نکلنا ہو گا اور اپنی روزی اس ملک میں حاصل کرنی ہے۔ امریکا میں ہر شخص کام کرتا ہے۔"

"مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "فرض کریں کہ فرانسیسی روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر آپ کی اس مہم میں رہنے کی ساری ضرورت ہیں، کیا آپ کسی عیسائی مبلغ سے ان چیزوں کو مانگتے ہوئے ہچکچائیں گے؟"

"ہاں میں ہچکچاؤں گا۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "میں کسی سے کچھ مانگتے ہوئے شرم سے گڑ جاؤں گا۔"

"اگر آپ کو پتا ہو کہ آپ اسے روٹی کے دو ٹکڑے اور پنیر کے دو پونڈ لوٹائیں گے، پھر بھی؟" میں نے پوچھا۔ "پھر بھی؟"

"پھر بھی!" مسٹر کوسک نے کہا۔

"ایسے مت بنیں مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "یہ ایک ہارے ہوئے ذہن کی سوچ ہے اور آپ کو اس کا علم ہے، کیوں کہ پھر آپ کو پیش آنے والا واحد واقعہ آپ کی وفات ہو گی۔ آپ وہیں چین میں مر جائیں گے مسٹر کوسک۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "تمہیں اور تمہارے باپ کو پنیر اور روٹی پیسے دے کر خریدنی ہو گی۔ تمہارا باپ باہر کیوں نہیں نکلتا اور کوئی کام کیوں نہیں پکڑ لیتا؟"

"چلیے مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "آپ کا حال کیا ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں جونی!" مسٹر کوسک نے کہا۔ "تم کیسے ہو؟"

"اس سے بہتر حال نہیں ہو سکتا مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔ "بچے کیسے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "استیپان نے اب چلنا شروع کیا ہے۔"

"کتنی شاندار بات ہے!" میں نے کہا۔ "انجیلا کیسی ہے؟"

"انجیلا نے گانا شروع کر دیا ہے۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "تمہاری دادی کیسی ہیں؟"

"اب وہ بہتر محسوس کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے بھی گانا شروع کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ ملکہ بننے کے بجائے اوپرا کی فنکارہ بننا زیادہ پسند کریں گی۔ مارتھا کیسی ہیں، آپ کی شریکِ حیات؟"

"اوہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔" مسٹر کوسک نے کہا۔

"میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے یہ جان کر کتنی خوشی ہوئی کہ آپ کا کنبہ بالکل بخیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، استیپان ایک دن ایک عظیم شخص بنے گا۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "میں اسے ہائی اسکول میں داخل کرواؤں گا اور اس بات کا خیال رکھوں گا کہ اسے ہر وہ موقع ملے جو مجھے زندگی میں نہیں مل

Scanned with CamScanner

سکتا ہوں میں چاہتا کہ وہ کریانے کی دکان کھولے۔"
"مجھے انسان کی ذات پر بہت اعتماد ہے۔" میں نے کہا۔
"جونی! تمہیں کیا لینا ہے؟" مسٹر کوسک نے کہا۔ "اور تمہارے پاس پیسے کتنے ہیں؟"
"مسٹر کوسک،" میں نے کہا۔ "آپ کو علم ہے میں یہاں کچھ نہیں خریدنے آیا۔ آپ کو علم ہے کہ میں آپ کے ساتھ پرسکون خوشگوار گفتگو سے اکثر وبیشتر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مجھے فرانسیسی روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر لینا ہے۔"
"تمہیں ادائیگی نقد کرنی ہو گی جونی؟" مسٹر کوسک نے کہا۔
"اور ایستھر؟" میں نے کہا۔ "آپ کی خوبصورت صاحبزادی کا کیا حال ہے؟"
"ایستھر بالکل ٹھیک ہے جونی،" مسٹر کوسک نے کہا۔ "مگر سودا تمہیں نقد ملے گا۔ تم اور تمہارا باپ اس پورے ملک میں بدترین باشندے ہو۔"
"مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ایستھر بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مسٹر میک گریگور ہمارے گھر مہمان ہیں۔ وہ ایک عظیم اداکار ہیں۔"
"میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔" مسٹر کوسک نے کہا۔
"اور مسٹر میک گریگور کے لیے بیئر کی ایک بوتل۔" میں نے کہا۔
"میں تمہیں بیئر کی بوتل نہیں دے سکتا۔" مسٹر کوسک نے کہا۔
"آپ ضرور دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"نہیں دے سکتا۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "میں تمہیں باسی روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک پونڈ پنیر دے دوں گا۔ بس! اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمہارا باپ جب کام کرتا ہے تو وہ کس طرح کا کام کرتا ہے جونی؟"
"میرے والد شاعری لکھتے ہیں مسٹر کوسک! بس یہی ایک کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ شاعری لکھنے والوں میں دنیا کی ایک عظیم شخصیت ہیں۔"
"اسے کوئی معاوضہ ملتا ہے؟" مسٹر کوسک نے کہا۔
"انہیں کبھی کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔
"مجھے اس طرح کا کام پسند نہیں۔" مسٹر کوسک نے کہا۔ "تمہارا باپ دوسرے لوگوں کی طرح کا کام کیوں نہیں کرتا جونی؟"
"وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے والد ایک عام آدمی کی بہ نسبت دگنی محنت کرتے ہیں۔"
"اچھا اب تم پر پچیس سینٹ ادھار ہو گئے ہیں جونی؟" مسٹر کوسک نے کہا۔ "میں اس بار تو تمہیں کچھ چیزیں دے رہا ہوں، مگر اس کے بعد بالکل بھی نہیں۔"
"ایستھر سے کہیے گا کہ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" مسٹر کوسک نے کہا۔
"خدا حافظ مسٹر کوسک!" میں نے کہا۔
"خدا حافظ جونی!" مسٹر کوسک نے کہا۔

میں فرانسیسی روٹی کے ایک ٹکڑے اور ایک پونڈ پنیر کے ساتھ گھر کی طرف دوڑا۔ میرا باپ اور مسٹر میک گریگور سڑک پر یہ دیکھنے کو کھڑے تھے کہ میں کھانے کی چیزوں کے ساتھ واپس آتا ہوں یا نہیں۔ وہ میری طرف آدھے راستے تک دوڑتے ہوئے آئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ چیزیں موجود ہیں تو انہوں نے گھر کی سمت ہاتھ لہرائے جہاں میری دادی منتظر تھی۔ وہ اندر دوڑی تاکہ میز آراستہ کر سکے۔

"مجھے پتا تھا کہ تم کامیاب ہو گے۔" میرے باپ نے کہا۔
"اور مجھے بھی۔" مسٹر میک گریگور نے کہا۔
"مسٹر کوسک کہتے ہیں کہ ہمیں پچیس سینٹ ادا کرنے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں اب وہ ہمیں اور ادھار نہیں دیں گے۔"
"یہ محض ان کا خیال ہے۔" میرے باپ نے کہا۔ "جونی! تم نے ان سے کیا باتیں کیں؟"
"پہلے تو میں نے بھوکے ہونے کے بارے میں باتیں کیں اور چین میں موت کے دروازے پر پڑے ہونے کے بارے میں۔" میں نے کہا۔ "پھر میں نے ان کی بیٹی کا حال دریافت کیا۔"
"کیسی ہیں ان کی گھر والی؟" میرے باپ نے کہا۔
"بخیریت۔" میں نے کہا۔

اس طرح ہم سب اندر چلے آئے اور ہم نے روٹی کے ٹکڑے اور پنیر کے پونڈ سے پیٹ بھرا۔ ہم میں سے ہر ایک نے دو یا تین گلاس پانی پیا۔ جب روٹی کا ہر ذرہ غائب ہو گیا تو مسٹر میک گریگور نے باورچی خانے کی سمت جائزہ لینا شروع کیا تاکہ انہیں کھانے کو کچھ اور مل سکے۔
"وہاں پر اس سبز ٹین میں کیا ہے جونی؟" انہوں نے کہا۔
"شیشے کی گولیاں۔" میں نے کہا۔
"اور یہ الماری؟" انہوں نے کہا۔ "اس میں کھائے جانے کے قابل کوئی شے ہے جونی؟"
"کٹل بیگ۔" میں نے کہا۔
"اور کونے والے بڑے مرتبان میں جونی؟" انہوں نے کہا۔ "وہاں کون سی کارآمد چیز ہے؟"
"اس مرتبان میں میں نے ایک سانپ پالا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔
"خوب!" مسٹر میک گریگور نے کہا۔ "میں ابلے ہوئے سانپ کا ایک ٹکڑا شاندار طور پر کھا سکتا ہوں جونی۔"
"آپ اس سانپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے کہا۔
"کیوں نہیں جونی؟" مسٹر میک گریگور نے کہا۔ "آخر کیوں نہیں بیٹے؟ میں نے سنا ہے بورنیو کے اصلی باشندے خلا مسل کے سانپ اور جھینگر کھاتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس آدھی درجن جھینگر بھی نہیں ہیں جونی؟"
"صرف چار ہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، انھیں باہر نکالو۔" مسٹر میک گریگور نے کہا۔ "اور جب ہم سیر ہو چکے ہوں گے میں تمھارے لیے بگل پر مجھے صرف ہیں اسکینوں سے پہاڑ و گاؤں گا۔ میں بے حد بھوکا ہوں۔"

"میری حالت خراب ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر آپ سب کو کچھ کیسے نہیں ہو رہا ہے۔"

میرا باپ میز پر اپنے سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ میری دادی گھر میں تھوڑا پھر رہی تھیں۔ وہ پکشی کا نغمہ گنگنا رہی تھیں۔ "جب میں سڑک پر گشت کرتی..." وہ اطالوی میں گرج رہی تھیں۔

"تھوڑا سی موسیقی کیسی رہے گی؟" میرے باپ نے کہا۔ "میرا خیال ہے میرا بیٹا بہت خوش ہو گا۔"

"میں یقینا خوش ہوں گا مسٹر میک گریگور؟" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جونی؟" مسٹر میک گریگور نے کہا۔

اس طرح وہ اٹھے اور انھوں نے بگل بجانا شروع کیا اور انھوں نے اسے اتنا تیز بجایا کہ کبھی کسی نے بگل کو اتنا تیز نہیں بجایا ہو گا۔ اور انھوں نے دور کے لوگوں نے ان کی آواز سنی اور خوش ہو کر آ گئے۔ ہمارے گھر کے گرد اٹھارہ پڑوسی جمع ہو گئے اور جب مسٹر میک گریگور نے اپنی پیش کش ختم کی تو انھوں نے بے اختیار داد دی۔ میرے باپ مسٹر میک گریگور کو باہر پورچ میں لے گئے اور انھوں نے کہا: "چند پڑوسیو اور دوستو! میں آپ سے مسٹر میک گریگور کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے وقت میں سب سے بڑے شیکسپیرین اداکار۔"

ایک پڑوسی اور دوست کچھ نہیں بولے اور مسٹر میک گریگور نے کہا: "میں ۱۸۶۲ میں لندن میں اپنی پہلی کارکردگی کو یاد کرتا ہوں، جیسے یہ کل کی بات ہو۔" اور اپنے پیشے کی تاریخ بیان کرنے لگے۔ روزنہ ایک بڑھئی نے کہا "تھوڑا سا اور موسیقی کیسی رہے گی مسٹر میک گریگور؟" اور مسٹر میک گریگور نے کہا "کیا تمھارے گھر میں ایک انڈا ہے؟"

"ضرور ہے۔" روزنہ نے کہا۔ "میرے گھر میں ایک درجن انڈے ہیں۔"

"تمھارے لیے یہ زیادہ دشوار تو نہیں ہو گا کہ تم جا کر ان ایک درجن انڈوں میں سے ایک انڈا لے آؤ؟" مسٹر میک گریگور نے کہا۔ "جب تم لوٹو گے تو میں تمھارے لیے ایک ایسا گیت گاؤں گا جسے سن کر تمھارا دل خوشی اور غم سے اچھلنے لگے گا۔"

"میں بس چل پڑا ہوں۔" روزنہ نے کہا اور وہ انڈا لانے اپنے گھر کو چلا گیا۔

پھر مسٹر میک گریگور نے ٹام باوری سے پوچھا کہ کیا اس کے گھر میں کباب کا ایک ٹکڑا ہے اور ٹام نے کہا کہ ہے، اور مسٹر میک گریگور نے ٹام سے کہا کہ اس کے لیے یہ زیادہ دشوار تو نہیں ہو گا کہ وہ جا کر کباب کا ٹکڑا حاصل کرے اور اسے لے آئے اور جب وہ واپس آئے گا تو مسٹر میک گریگور بگل پر ایک ایسا نغمہ پیش کریں گے جو ٹام کی تمام زندگی کی تاریخ بدل دے گا۔ اور ٹام اپنے گھر کباب لانے کے لیے چلا گیا اور مسٹر میک گریگور نے ہمارے چند پڑوسیوں اور دوستوں میں سے ہر ایک سے کھانے کی تھوڑی سی عمدہ چیزوں کے متعلق پوچھا، اور ہر شخص نے اثبات میں جواب دیا، اور انھوں نے کہا کہ ہر شخص اپنے گھر سے کوئی چھوٹی اور

عمدہ سی کھانے کی چیز لائے تاکہ مسٹر میک گریگور وہ گانا گا سکیں جو حقیقتاً ان کا شاہکار ہو گا۔ اور پھر تمام چند پڑوسی اور دوست کھانے کی چھوٹی چھوٹی عمدہ چیزوں کے ساتھ ہمارے گھر کو لوٹے۔ مسٹر میک گریگور نے بگل کو اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور "میرا دل پہاڑیوں میں رہ گیا، میرا دل یہاں نہیں" گایا اور ہر اچھا پڑوسی اور دوست اس پر رویا اور ہر گھر واپس ہوا اور مسٹر میک گریگور تمام عمدہ چیزیں ہمارے باورچی خانے میں لے گئے اور ہمارے خاندان نے دعوت اڑائی۔ ہم لوگ بیٹھے ہوئے ایک ایک کباب، ایک درجن سبز پیاز، دو طرح کے پنیر، دو طرح کی روٹیاں، بھنے ہوئے تازہ ٹماٹر، ایک خربوزہ، چائے اور بہت سی اور کھانے کی عمدہ چیزیں، ہم کھاتے گئے اور ہمارا پیٹ پھوٹ گیا اور مسٹر میک گریگور نے کہا "حضور عالی! اگر آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو میں آپ کے ہاں چند دنوں کے لیے قیام کرنا چاہوں گا۔" اور میرے باپ نے کہا "حضور عالی! یہ آپ ہی کا گھر ہے۔" اور مسٹر میک گریگور ہمارے گھر پر ستائیس دنوں اور ستر راتوں کے لیے رکے اور انیسویں دن کی دوپہر ایک شخص بوڑھے لوگوں کی رہائش گاہ سے ہمارے گھر آیا اور اس نے کہا

"میں جیمسپر میک گریگور کی تلاش میں ہوں، وہ اداکار ہیں۔" اور میرے باپ نے کہا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں بوڑھے لوگوں کی رہائش گاہ سے آیا ہوں۔" نوجوان نے کہا۔ "اور چاہتا ہوں کہ مسٹر میک گریگور ہمارے ہاں واپس آ جائیں کیونکہ ہم دو ہفتوں کے اندر اپنا سالانہ کھیل پیش کر رہے ہیں اور ہمیں ایک اداکار کی ضرورت ہے۔"

مسٹر میک گریگور فرش پر سے، جہاں وہ خواب دیکھ رہے تھے، اٹھے اور نوجوان کے ساتھ چلے گئے۔ اور اگلی دوپہر جب ہم بہت بھوکے تھے، میرے باپ نے کہا "جونی! مسٹر کوسک کی دکان میں جاؤ اور کھانے کے لیے تھوڑی سی عمدہ چیز حاصل کرو۔ مجھے معلوم ہے تم ایسا کر سکو گے جونی۔ کوئی بھی چیز لے آؤ جو مل سکے۔"

"مسٹر کوسک اپنے پچیس سینٹ کا تقاضا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں پیسوں کے بغیر کچھ نہیں دیں گے۔"

"وہاں جاؤ تو جونی؟" میرے باپ نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ تم اس معمر سلاوکی شخص کو ہمیں کھانے کی کوئی چیز دینے پر آمادہ کر سکتے ہو۔"

پس میں مسٹر کوسک کی دکان پر گیا اور بعینہ مسئلے کو وہیں سے اٹھایا جہاں میں نے اسے پچھلی بار چھوڑا تھا اور میرے لیے اسٹور سے چڑیوں کے دانے کے ایک ڈبے اور آدھی شیشی شہد کے شربت کے ساتھ رخصت ہونا بڑی دشواریوں کے ساتھ ممکن ہوا مگر میں نے اسے کر ہی ڈالا، اور میرے باپ نے کہا "جونی! اس طرح کی چیزیں ضعیف خاتون کے لیے ذرا خطرناک ثابت ہوتی جا رہی ہیں۔" اور صبح کو ہم نے شک میں اپنی دادی کو ایک چڑیا کی طرح گاتے سنا اور میرے باپ نے کہا "ہم کس طرح ان چڑیوں کے دانے پر زندہ رہ کر عظیم شاعری کر سکتے ہیں؟"

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

استقبالیہ میں لگا ہوا آئینہ

مشاہدے کی اس ابتدائی قوت کے استعمال کے بغیر بھی یہ جانا جا سکتا تھا کہ میں مختلف ناموں کے ہوٹلوں سے منسوب یہ عمارت رہی ہے جس کا مجھے پتا دیا گیا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہونے کا راستہ، جو کسی بوسیدہ عمارت کا عقبی حصہ ہونے کی بہت مناسبت رکھتا تھا ستونوں کا متحمل تھا جس پر ایک بورڈ پر ایک ہی رسم الخط میں ہوٹل کے تینوں نام ایک دوسرے سے الجھے ہوئے لکھے دیکھے جاسکتے تھے۔ ہوٹل کا سب سے قدیم نام بورڈ کے طول عرض پر پھیلا ہوا تھا، جبکہ بعد کے ناموں نے بورڈ کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سب سے قدیم نام اگرچہ اب رنگ و روغن کھو چکا تھا مگر رقبے میں وسیع ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا۔ اسے پڑھنا یوں بھی آسان تھا کہ یہ ایک مختصر سا نام تھا صرف تین حروف پر مشتمل تھا۔ ہوٹل کا دوسرا نام پانچ حروف پر مشتمل تھا اور ایک مخصوص درجے کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ آخری نام جو بہ مشکل شوخ رنگوں میں حروف سے گل بوٹے بناتے ہوئے لکھا گیا تھا ان حرفوں میں گم ہو سکتا تھا۔ بورڈ کو دیکھ کر مجھے اپنی سابقہ بیوی کا خیال آیا جس کا میں تیسرا شوہر تھا، اور اس کے دوسرے دو شوہروں کا خیال بھی جو قید حیات میں ہیں۔

اگر بورڈ والے ستونوں کو صدر دروازہ مان لیا جا سکے تو بھی زمین کی اس ہموار سطح کو میں کوئی اچھا سا نام نہیں دے سکوں گا جو عمارت کے اس دروازے کے سامنے تھا جس پر غلط املا میں استقبالیہ لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ پوری عمارت میں کوئی حصہ محفوظ نہیں رہ سکا مگر مجھے استقبالیہ میں داخل ہوتے ہوئے ایسا خیال ہوا کہ یہاں رجسٹر کی دوسری طرف تو مجھے اپنی سابقہ بیوی بیٹھی ہوئی مل جائے گی، یا وہ محبوبہ جس کے اور میرے درمیان بیچ دیوار کھڑی کر دی گئی ہے یا میرا باپ جسے مجھے ... سڑک ہوٹل میں ... پڑا تھا۔

چھپی ہوئی تاریخ

اور

خیمۂ سیاہ

کے شاعر

افضال احمد سیّد

کی نظموں کا نیا مجموعہ

اکتوبر ۱۹۸۹ میں شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

استقبالیہ کا دروازہ شیشوں کی شکل سے کھل گیا۔ میز کی اس طرف والے آدمی سے میں نے اس آدمی کا پتا پوچھا جس سے ملنے میں یہاں داخل ہوا تھا۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں میز کی اس طرف والے آدمی سے واقف ہوں اور اس کی شکل میرے جیسی [illegible] رکھی ہوئی ہے۔ مثلاً مڑے ہوئے عنابی رنگ کی داڑھی، سیپیوں والی قمیص، [illegible] پرانے نام [illegible] سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اس شخص کی شباہت وہی ہو [illegible] میری ہو سکتی ہے۔ پھر ہم شکل سے ملنے کی حیرت اور آدمی [illegible] کے برابر لگنے کی بیہودگی کا احساس [illegible] ناقابل تقسیم پیمانے میں ایک ساتھ ہو گیا۔ آدمی کو ایسے موقعے پر خواب دیکھنے کے لیے جو ضرورت وقت ملتا ہے وہ مجھے نہیں دیا گیا۔ اب اس کے سوا میرے لیے کوئی [illegible] نہیں تھی کہ میں [illegible] مکھیوں [illegible] ہوئی دوپہر میں اس آئینے میں میں اپنے آپ کو بہت خوش کا نظر آیا۔ میں نے خود کو کئی زاویوں سے دیکھا اور یہی [illegible] فرق نہیں محسوس کیا۔ میں نے کسی [illegible] مگر مجھے [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] تک [illegible] جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ آئینے میں میں نے دیکھا۔ میری گھڑی [illegible] میری کلائی پر دیکھ رہا تھا۔ میری [illegible] پر ہلکا سا زخم کا نشان آئینے میں بھی میری کلائی [illegible] تھا۔ [illegible] نظر نہیں آ سکا۔ [illegible] استقبالیہ کی دیواریں [illegible] اور [illegible] وسعت [illegible] ہوئی [illegible] سے ہوائی [illegible] ساتھ پیوستہ [illegible] میں [illegible] سے ہم پر وہ لگایا گیا ہو [illegible] نہیں دیکھا جا سکتا۔

اگر مجھے اس آدمی کا پتا جس سے میں ملنے آیا تھا خود ہی سے پوچھنا تھا تو مجھے کہیں [illegible] نہیں۔ استقبالیہ سے باہر نکل کر صدر دروازے کی طرف سے ایک نوعمر کا تیزی سے [illegible] سے اچانک برآمد ہو گیا تھا یا [illegible] دروازے اور استقبالیہ کے درمیان رکھے ہوئے گرد آلود قدامت آرائشی پودوں سے منقلب ہو [illegible] رنگ [illegible] اور یہی رنگ [illegible] کی جلد پر بھی نمایاں تھا [illegible] مجھ پر یہ حیرت سے ساکت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے اپنا کسی طرح دشمن تصور کر سکتا، میں نے اس سے اس آدمی کا پتا پوچھا جس سے ملنے میں آیا تھا۔ لڑکے صرف ایک لفظ کہا جس کا مفہوم تھا میں نہیں جانتا، مگر آپ وہاں تک چل سکتے ہیں جہاں [illegible] رہا ہوں۔ نوعمر ہوٹل میں واقع ایک ادارے کے دفتر میں داخل ہو گیا اور اس کے ساتھ [illegible] وقت ضائع کیے بغیر میں نے بھی اپنے آپ کو دفتر کے اندرونی حصے میں پایا۔ یہ ایک مناسب [illegible] کا حال تھا جس میں بیس پچیس صوفے بےترتیبی سے پڑے تھے۔ ان تمام صوفوں کا [illegible] تھا مگر ان پر نقاشی، لکیریں اور رنگوں کی گہرائی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ تمام [illegible] میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ

صوفے بےترتیبی سے نہیں رکھے گئے ہیں [illegible] ترتیب سے [illegible] طرح ہیں کہ [illegible] بیٹھے [illegible] دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ احساس کہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے افراد مجھے اٹھا دیکھ کر [illegible] جمع گئے ہیں بہت واضح تھا مگر سرگوشی کے ایک وقت ہال میں جمع [illegible] شور پیدا ہو سکتا تھا وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

ایک آدمی دیواروں کے پیچھے سے ہوتا ہوا [illegible] کہتے ہوئے دروازے سے میں دیکھ سکا کہ فین کی اندر بھی میز رنگ کے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے ہم سے اندر جانے کی استدعا کی۔ یہاں نوعمر سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے کہا: یہ میرے ساتھ آئے ہیں، ان کو ایک آدمی سے ملنا ہے۔ کیبن کے اندر گھستے ہوئے آدمی نے غصے میں اپنا پاؤں فرش پر بجاتے ہوئے سبز قالین پر زور سے رگڑتے اور کہا: یہ استقبالیہ نہیں ہے۔

آدمی کو کتنا سچ کہنا اور کتنا سچ سننا چاہیے میں نہیں جانتا مگر میں اس وقت تک صوفوں والے ہال میں کھڑا رہا جب تک مجھے یقین نہیں آ گیا کہ ایک غیرمستند آدمی کو اپنے ساتھ یہاں تک لانے کے سبب نوعمر پر گوشہ تشدد نہیں کیا جائے گا۔

میں پھر استقبالیہ کی طرف نکل آیا۔ ایک نہایت عریض کمرے میں ایک شخص [illegible] کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، جیسے کسی خاموش عبادت میں مصروف ہو، یا کم از کم ہو چکا ہو۔ حالانکہ عرش کی ہست [illegible] جانے کے سر میں جس سے [illegible] بھی نکلا [illegible] میں اس آدمی کو ہرگز تکلیف نہ دیتا اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ یہی وہ شخص ہو جس سے میں اپنے مطلوبہ آدمی کی بابت جان سکتا ہوں۔

میں اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ شخص بغیر کسی [illegible] کے جیسے کسی حکم پر نفس کشی کی طویل مزیت کی تعمیل [illegible] جھک کر میرے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس آدمی کا پتا جس سے میں ملنے آیا تھا اس شخص سے پوچھا۔ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے اس آدمی کا نام دوبارہ بتایا۔ اس نے دوبارہ کہا: نہیں۔ اب کی میں نے [illegible] کے نام کے ساتھ ساتھ جس میں مطلوبہ شخص چلا رہا تھا۔ جس آدمی سے میں ملنے آیا تھا وہ [illegible] کر درمیان سے ہٹ گیا اور مجھے گزرنے کا اشارہ کر کے کہا: سیڑھیوں سے دوسری منزل پر۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا یا نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو کہ مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ میں نے یہ جانیں [illegible] کے [illegible] پر کس زبان کے حروف ہیں، اپنے سامنے کا دروازہ کھولا اور خود کو پھر استقبالیہ میں پایا۔ میں اپنی شکل پر غور کیے بغیر میں نے [illegible] مصنوعی [illegible] دیکھیں اور [illegible] کی سیڑھیوں پر دوڑنے لگا۔ سیڑھیوں کی نکڑی [illegible] پر میری رفتار [illegible] حکم رکھی ہو گی مگر میں اپنے بدن میں شدت تھا کہ [illegible] گر بھی جاتا [illegible] بچتا ہو [illegible] قالین بغیر کسی سہارے کے بھی [illegible] ہر ہوئی سیڑھیوں پر میرے ان میں کم سے کسی نے کوئی خطر پیشگی نہیں [illegible] اور نہ پہلی منزل کے دوسرے کمرے کے جوش دروازے سے کوئی نوعمر نیم برہنہ لڑکی چیخ مارتی ہوئی برآمد ہوئی۔

دوسری منزل پر بالکل سامنے [illegible] شیشوں [illegible] کے بڑے [illegible]

Scanned with CamScanner

پر رکھ کر رکھا گیا تھا جہاں میں ایک آدمی سے ملنے آیا تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ دروازے کا نام بھی نہیں لکھ کر رکھا گیا تھا۔ مقررہ وقت سے پہلے کر جس میں استقبالیہ میں اپنے آپ سے اس آدمی کا پتا پوچھ رہا تھا، استقبالیہ کی جالی کمرے میں بیٹھنے والے آدمی سے پتا پوچھنے تک میں نے اپنی انگلی سے حروف کو چھوا۔ میری انگلی سیاہ ہو گئی۔ پیرہن میں اپنی قمیض کے نیچے پونچھ سکا اس سے کہ دفتر کے اندر سے ایک آدمی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ آدمی دفتر کے مرکزی کمرے میں چلا گیا اور اس نے وہاں کچھ کہا جس میں میں صرف اپنا نام سن سکا جو بالکل صحیح تلفظ کے ساتھ ادا ہوا تھا۔

یہاں تقدیر و بے حسی [illegible] میں ملنے آیا تھا وہ مرکزی کمرے سے نکل آیا۔ ہو ایک سال پہلے ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے کہا۔ شام ہونے تک ہم اپنی گزشتہ اور آئندہ ملاقاتیں یاد کر کر کے لطف اندوز ہوتے رہے اور یہ ٹھیک ہو گیا کہ ہماری دوستی کے منقطع ہونے کا سبب بھی زندہ ہے۔ جس آدمی سے میں ملنے آیا تھا اس پر اتنی سرشاری طاری تھی جو میں تین ناموں والے ہوٹل میں کسی شخص پر شاید ہی کبھی طاری ہوئی ہو گی۔ دفتر میں سب سے اہم حیثیت رکھتے ہوئے بھی میرے ہی میں وہ خود چائے بنا لایا اور دنیا کی نفیس ترین پیالی میں مجھے پیش کی۔ میری آمد کی خوشی میں دفتری اوقات ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ آدمی بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ اور جب ساری باتیں اس حد پر پہنچ گئیں جہاں سے معلومات مہر [illegible] اور تقدیر میں ردوبدل ناممکن ہو جاتا ہے، تو ہم دفتر سے نکل آئے۔

سیڑھیوں سے نیچے اتر کر وہ کمپیوٹر جمع کرانے استقبالیہ میں داخل ہوئے۔ میں بھی اس آئینے کو ایک بار پھر دیکھنے اس کے ساتھ چلا آیا جس میں شیں خوش کا نظر آیا تھا۔

آئینے میں میرا عکس اپنی جگہ سے غائب تھا۔

لاوانیا کے قریب

جہاں خاموشی کے گرد مسطح پیچ دار مقرر ہیں، وہاں میں اس کے ساتھ روٹی کو روٹی اور شراب کو شراب کہتا ہوں۔ وہ اپنی سبز انگلیوں سے ایک آبی گھنٹی کو چھوتی ہے اور مردہ گھر سے [illegible] کون سے دم کے پھولوں کی شاخوں کو مجھ سے کرتے لگتے ہیں۔ [illegible] بارش کے نیچے ایک مرد کا عورت کو پھول پیش کرنا [illegible] ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ امید جو ہماری رات اور ہمارے دن کو بےترتیب کرتی ہے، اسے سیاہ مسوہر کی درست تک لے جاتی ہے۔ [illegible] زمین کا نام ابد ہے، جہاں ہم انگوروں کے ساتھ سونے اور کشید کیے جاتے ہیں۔ وہاں میں ایک گھوڑا پیش کرتا ہوں اور وہ مجھے زیتون کا پودا، وہ جو شیشے اور لکڑی اور پتھر اور اون سے بنی ہے۔

لاوانیا کے قریب میں اس کے پانچ زخموں والے پھول کو چھوتا ہوں، اور پورا ماروسا کو چند

کرتے ہوئے اس کے ہونٹ چومتا ہوں۔ میں نے مطبل [illegible] کے باہر گئے وہی جوہری ہوں، مقدسوں والی لوح، جان کی سب سے تنہا مچھلی، ایک دل شکستہ شہزادی کی یاد، خشکی پر لے جانے والا آرگونات۔

چند سالوں میں ہم کئی موسموں سے گزر جاتے ہیں، اور اب شدید برف پڑ رہی ہے اور میں اسے صرف پھولوں سے شناخت کرتا ہوں۔ چاند برج سنبلہ میں ہے۔ اس عمارت کی انتیس پورے چاند میں بیت گئی ہیں۔ میں ان دنوں ایک پرخطر زندگی گزار رہا ہوں اور خوب کی مجھے پاس کوئی اطلاع نہیں ملی۔

کیا اس کی کھلی ہوئی نیلی آنکھوں کو اس سے زیادہ غلط سمجھا جا سکتا ہے؟

مجھے ایک کاسنی پھول پسند تھا

مجھے ایک کاسنی پھول پسند تھا۔ اس سے میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف ہے جسے میں ہم جماعت میں اس کا نام بھی نہ سکتا ہوں لیکن دنیا بہت گنجان آباد ہے۔ وہ مجھے [illegible] ملی تھی جو میرے گھر سے دور ایک جھیل پر سیاحوں میں ساتھ ساتھ دیے گئے تھے۔ ہم ایک پل پر ساتھ چلے اور کبھی الگ الگ پتوں پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے۔ میں نے [illegible] مزدوری سے کبھی خریدیں اور پانی کے بولتے ہوئے مخروں کو جوانی کے درمیان اس کی سکھیوں کے بیچ شعر بناتے ہوئے ایک کرن کو اپنی ہتھیلی میں دبا لیا اور معلوم کیا کہ میں لکڑی کا بنا ہوا نہیں ہوں۔ شاید وہ پل کسی خانہ جنگی میں جلا دیا گیا ہو۔ میں زندگی بھر پھر کسی پل کو کبھی نہیں خرید سکا۔

ملک الشعرا نُبار اِسپاریان کا ایک مطلع

ملک الشعرا نُبار اِسپاریان نے اپنی کنیز ارما کی چھاتیوں کے لیے جو مطلع کہا، اس کا حسن ترجمے میں اسی طرح ضائع ہو جاتا ہے جیسے ارما کی چھاتیاں [illegible] کی ریت میں گل سڑ گئیں۔ رجب میں یہ مطلع ان اشعار پر مشتمل لے گیا جو سارا اسپاریان نے بھی محبوبہ اور ہم عصر شاعرہ میرا مطلبدیان کی آنکھوں سے متعلق لکھے تھے اور شاعری کی اعلیٰ ترین مثال میں پیش کیے جاتے تھے۔ [illegible] مطلبدیان اس مطلع سے اس قدر برداشتہ ہوئی کہ کئی بار اس نے چاہا کہ اپنی [illegible] مجبور [illegible] جو اسپاریان کے دیے ہوئے خنجر سے جس کو سے صرف اپنے دل میں اتارنے کی اجازت تھی، اپنی آنکھیں برباد کر دے۔ آرمینیا کے طول و عرض میں ملک الشعرا [illegible] اسپاریان کا مطلع اب مشہور ہو کہ [illegible] عورتوں سے لے کر [illegible]

بہر حال کہ [illegible] ہیں کہ وہ اپنی چھاتیاں
اس کے لیے برہنہ کرنے پر رضامند ہیں، اگر وہ اس مطلع کے برابر یا کچھ کم تر مطلع ان کے لیے کہہ
سکیں۔ مطلع کی شہرت سے پریشان ہو کر تذکرہ نویسوں نے تواتر سے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ
بہار اصفہانی نے کبھی ارما کی چھاتیوں کو برہنہ نہیں دیکھا، یا اپنے ہاتھوں سے محسوس بھی
کیا۔ کیوں کہ دیکھی ہوئی یا محسوس کی ہوئی چیز پر ایسی شاعری انسانی امکان سے بالاتر
ہے۔ ارما کو ان تذکروں اور سیموں کے اس باغ کی خبر تھی جس کے عرش تبار اصفہانی نے اسے
[illegible] کہ [illegible] کی چھاتیوں کے سحر نے تذکرہ نویسوں کو حد میں شاعری
سے کنارہ کش ہوتے جا رہا ہے۔ اس سے بھی کہ اگلے تذکروں میں یہ لکھا جاتا کہ ملک الشعرا بہار
[illegible] شعر کو [illegible] ارما نے [illegible] کی پرستش گاہ میں جا کر صبر کے
خنجر سے اپنی چھاتیاں قطع کر کے دیوتا کی پشت پر ڈال دیں۔

ذی شان ساحر

سرمہ

جب میں
باغ میں جاتا ہوں
باغ کے دروازے پہ
وہ اپنا سرمہ میری آنکھوں میں لگا دیتی ہیں

پھر نہ مجھے پھول نظر آتے ہیں
اور نہ تتلیاں
اندھوں کی طرح گرتے پڑتے
کبھی کانٹوں میں الجھتا ہوں
اور کبھی پکڑتا ہوں کیکٹس کو
سہارے کے لیے

کبھی نزدیک سے آتی ہے
کسی کے قدموں کی آواز
کوئی مجھے اٹھاتا ہے
اور اپنے رومال سے میری آنکھیں صاف کرتا ہے

ہوا میں لرزتے ہوئے پھول
کئی رنگوں میں ڈوبی تتلیاں
بیرنگ کانٹے

Scanned with CamScanner

ہمارا وعدہ ہے
اب اسے جینے نہیں دیں گے
اگر اس کا گھر
ایک ہزارویں منزل پہ ہے
تو ہم اسے کہیں گے
سیر سبزہ زمین
یا پھر لفٹ کے گھر جانے کو
یا بہتر یہ ہو گا
کہ اس کے گھر
اور اس کے گھر جانے والا ہر راستہ
ہی ختم کر دیا جائے
یا لوگوں سے کہا جائے
وہ اس کے راستے کو راستہ
اور گھر کو گھر نہ رہنے دیں

اگر اس نے کوئی پھول توڑا
تو ہم پھولوں کی ساری قسمیں
سارے باغ ہی ختم کر دیں گے
اگر اس نے کسی تتلی کو چھوا
تو ہم ہر جگہ
تتلیوں کے داخلے پر پابندی لگا دیں گے
اگر وہ درختوں کی طرف دیکھے
تو ان میں سے پتے گر جائیں
اور پرندے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں چلے جائیں
اگر وہ کسی دریا کی طرف جائے
تو وہ دریا نہ شہر کی طرف آئے
اور نہ سمندر کی طرف جائے

ہم اور آپ اگر اسے دیکھیں
تو شاید پتھر کے ہو جائیں
ہم نہ اسے دیکھیں گے نہ یاد کریں گے

اگر اس نے کبھی ہمارے شہر کے بارے میں سوچا

اور ملکی سبز گھاس
ساتھ ہی ساتھ
صاف ستھرے ہوئے
سیب اور آڑو کے درخت
ہری بھری شاخیں اور چڑیاں

میں باغ کی خوب سیر کرتا ہوں
وہ مجھے دیکھتے ہیں
اور سرحد صاف کرنے پہ
مجھے دوزخ کا ٹکٹ دیتے ہوئے
سلطان کی طرف چلے جاتے ہیں

مجرم

وہ مجرم ہے
ہمارا
ہم اسے مار دیں گے
اسی جرم میں
کہ وہ ہمارا مجرم ہے
اور اسی جرم کی ہم
اسے سزا دیں گے

اور اگر ہم اسے
ہر ممکن سزا نہ دے سکے
تو جو بھی اسے مارے گا
یا اس راستے میں مارا جائے گا
جس پر ہم چل رہے ہیں
ہر اس کے لیے
حسن بن صباح کی جنت
اسلام میں ہے
یا اس سے بھی کچھ زیادہ

نسرین انجم بھٹی

چوہے

چوہے ہمارے خاندانی دوست تھے
بھوک کے کالے دنوں میں ہماری آبرو رکھتے اور کبھی ہمارے گھر نہ آتے
لیکن کھلے دنوں میں اناج کی خوشبو ہمارے ان کے
دونوں کے درمیان دشمنی بن جاتی
ایک ہی روٹی کی چاریں تہیں کبھی ہماری نہ ہوتیں
چمکتی ہوئی گول گول حریص آنکھیں ہماری بھوک آدھی میں سے کتر ڈالتیں
کبھی ہم روٹی ہاتھ سے چھوڑ دیتے
اور کبھی کسی چھوٹے کی کلائی اس مضبوطی سے پکڑتے کہ روٹی خود بخود نیچے گر جاتی
"حرامی سؤر..."
مگر وہ کبھی سؤر نہ بنتے چوہے ہی رہتے
ہمارے معدے کاٹتے کاٹتے ہماری شہ رگوں تک آ جاتے
"اماں ری، بولتے کیوں نہیں ہیں، میری روٹی چوہا لے گیا"
اماں کا جوتا چوہے کے پیچھے جاتا لیکن رفتار کا فرق ہمیں کبھی جیتنے نہ دیتا
اور ہم ان کی کہانی ہونٹوں میں سے کھاتے
چوہے دان ان دنوں روپے سے مہنگا تھا، اور ہم چوہوں سے زیادہ
ہماری آنکھیں بھی اتنی ہی چمکتی تھیں
اور ہماری دمیں نکلنے میں شاید کسی بات کی دیر نہ تھی
بھوک کے دن عشق کے دن ہوتے ہیں لیکن ہم ان دنوں جی بھر کر نفرت کرتے تھے
سوتے میں دانت کچکچا کچکچا کر بھوک اور بڑھا لیتے
یہاں تک کہ دانت گھسے اور زبان کڑوی ہو جاتی

ذی شان ساحل

کی نظموں کا نیا مجموعہ

جزیرے کا شور

سنہ ١٨٩ میں شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

پتا نہیں جسم کا نمک کہاں چلا گیا تھا
ورنہ کبھی کبھی اپنے ہی بازو کاٹ کر بڑا مزا آتا تھا
انکار کی ساری قوتیں قَم پر کھڑک ہو جاتیں اور ہم کبھی ہار نہ کہتے
ہمیں لگتے ہی آدھی بھوک مر جاتی
اور اماں کے پلو میں دکھ کی زرکاری بڑھ جاتی
ہماری پلو میں سے الٹیاں مٹکاتی کی خراب کتی پر سونے پر پھیل گئے تھے
اور اب اتنی معتدلا گئی تھی کہ ان میں سے صرف چوہوں کی چمکتی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں
بھوک کی وقتی تھی ہو جاتی تو کبھی کبھی ہم میں صلح ہو جاتی
اور ہم ان کے منہ سے روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنے کے لیے دوست بن جاتے
انہی دنوں ہم نے گھات لگانا سیکھا اور دوستی دشمنی کے اصول طے کیے
جو شاید کہانی کے دنوں تک یاد نہ رہتے ہوں گے
پھر بھی ہماری آنکھیں ایک ثبوت انگیز مشترکہ درد سے مسکرا اٹھیں
"وہ مارا!"
"نہیں نکل گیا"
روٹی چھوڑ کر نہیں بھاگا"
پھر ہم نظر نہیں ملاتے تھے
اور کئی دنوں تک چوہے بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے
"چوہوں کا گوشت کیسا ہوتا ہو گا؟"
"چپ مسخری! ہم مسلمان ہیں"
"اماں رکھا اسے روک لی نا"
اور اماں کا جوتا آدھے راستے میں گر جاتا
ابھی بچوں اور چوہوں میں فرق باقی تھا
"اماں رفو تیرے کپڑے چوہا کاٹ گئی"
اور وہ کپڑوں کے بجائے اپنا پیٹ ٹٹولنے لگتی
اسے معلوم تھا کہ کپڑوں کا آخری جوڑا تو وہ پہنے ہوئے ہے، اور
اس کے بعد
دن میں پھریں گے
اندھیرا جو ان دنوں چھانے لگا تھا پھر ہمارے حلق میں اتر آیا
اور چوہے نظر آنے بند ہو گئے
اور اب تو بھوک رہنے کا مزا بھی جاتا رہا
وقتوں میں سے چوہے غائب ہو جاتے تو شاید دن رات کا فرق مٹ جاتا تھا
ہمیں صبح سے چھوٹی تھی
اور ماں بیٹے کا فرق مٹانا صبح سے پہلے ہی نے ہی شروع کیا تھا

پھر پانچوں بہن بھائی بھی اسی کام میں لگ گئے
اور ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہ رہی
کبھی کبھی کوئی کھانستا تو ہنسی آ جاتی
جیسے بند کانوں میں سے کوئی آواز سنائی دے
کھوں کھوں — کھوں کھوں اور بس
کوئی چکر قائم نہ ہوتا
ہمیں لگا کہ کھمبے ہمارے درمیان اگنے لگے تھے
اور کھانسی ہمارے بالوں کی شکلوں میں محسوس ہوتی تھی
ہماری ساری پلکیں جھلا چکی تھیں
جس دن ہمارے دروازے پر دستک ہوئی، کوئی نہ اٹھا
دروازہ تو کھلا تھا
راکھ کی ڈھیروں میں ادھ جلی لکڑی کی زبانیں
باپ لوٹا تو دیواریں لپکیں
جلی کاغذ جیسا دوپٹہ اماں کے سر سے سرک گیا
تو لکڑیوں والی بڑھیا اس کے ماتھے پر روٹی کا ٹکڑا چھوڑ کر بھاگی
اور باپ
چولہے داں میں گھر کی راکھ بھرنے لگا

نسرین انجم بھٹی

کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

سعید الدین

کاٹا ہوا پتھر

دریا کچھ نہیں
اس کے جل کی مٹھاس کچھ نہیں
اس کی مچھلیاں اور اس کا ٹھہراؤ کچھ نہیں
میں جب ایک کاٹا ہوا پتھر اس میں پھینکتا ہوں
تو دریا ایک گیت بن جاتا ہے
جو اپنے اتار چڑھاؤ اور ٹھہراؤ میں
زندگی سے کم پُرشور نہیں
اور زندگی کا یہی شور دریا ہے
یہی مچھلی، یہی مچھیرا
یہی میٹھا جل
اور یہی شاعری ہے

نظم

شور کم کرو
آہستہ بولو
تاکہ تمھاری آواز
کم سے کم اُن تک تو پہنچ جائے
جو تمھیں سننا چاہتے ہیں

Scanned with CamScanner

محبت کرنے والے

اگر انہیں پتا چل جائے
میرے بدن پر آگ لگی ہوئی
تو وہ خاموش رہیں

مجھ سے محبت کرنے والے
اپنی دھندلی لینس میں شفاف جھوٹ دیکھتے ہیں
اور لینس صاف کیے بغیر سو جاتے ہیں
حق کی راہ میں
یہی اُن کا جہاد ہے

مجھے معلوم ہے
وہ ایک دن مجھے محبت سے دبوچ کر
میری پسلیاں توڑ دیں گے
اور مجھے وہ سیڑھیاں چڑھا دیں گے
جن سے اوپر
کسی مذہبی پیشوا کی دعا یا بددعا نہیں پہنچ سکتی

میری محبت میں
میری موت پر وہ روئیں گے
اور روتے روتے سو جائیں گے

نظم

سفید کاغذ پیلا پڑ چکا ہے
اور عبارت دھندلی ہو گئی ہے
جلد اُدھڑ چکی ہے
اسے لکھنے والا مر گیا ہے

آثارِ قدیمہ کے ماہرین
اور زبانوں کے محققین
اس نتیجے پر پہنچے ہیں

که یه کتاب کسی مردہ زبان میں لکھی گئی ہے
جو اب زمین کے کسی خطے میں بولی یا سمجھی نہیں جاتی

رات کے کسی پہر آثار قدیمہ کے ایک ماہر کی آنکھ کھل جاتی ہے
وہ لکڑی کے وزنی صندوق سے کتاب نکالتا ہے
بوسیدہ سرورق پر مصنف کی جگہ اس کا نام لکھا ہے
کتاب کسی بادشاہ کے نام معنون کی گئی ہے

پہلے صفحے پر سرکاری خزانے کا حساب ہے
دوسرے صفحے پر پروہت کے جاری کردہ عبادت کے احکام
تیسرے صفحے پر ان مجرموں کے نام ہیں
جنہیں ایک منحوس دعا کے جرم میں
دوسرے دن صلیب پر چڑھایا جانا ہے
اس کے بعد کچھ سادہ صفحات ہیں
شاید کتاب کا مصنف بھی مار دیا گیا
جس کی تصدیق آگے کی ان دعاؤں سے ہوتی ہے
جو مرنے والوں کی مغفرت کے لیے سرکاری پروہتوں نے مانگیں
اور جو بدلی ہوئی تحریر میں تھیں

کتاب کے آخری صفحے پر
بادشاہ کی موت کی خبر تھی
اور اس کے نیچے ایک منحوس دعا
جسے آثار قدیمہ کے ماہر نے فوراً پہچان لیا

معلم

مٹی میں ڈھیر دیے
یہ میرا بدن مٹی ہوتا جا رہا ہے
سارے موسم ساری ہوائیں مُصر ہیں
مجھے مٹی بنانے پر

میں کبھی چوک کی گھڑیال کا مینارہ تھا

یا کسی مضبوط قلعے کی فصیل

میں جو کچھ بھی تھا
اب دفن ہوں
اور اب لوگوں نے مجھے دریافت بھی کر لیا
تو مجھے کسی چوک کے گھڑیال
یا کسی مضبوط قلعے کی فصیل کا مقام نہیں ملے گا
مجھے صرف قدیم آثار کے طور پر قبول کیا جا سکے گا
میں بیج بن سکتا ہوں
نہ درخت
نہ آبشار

میری شدت اتنی مٹی تلے بھی
اسی ٹھنڈک اور حرارت سے سانس لیتی ہے
جیسے کسی چوک یا کسی پہاڑ پر
میرا وجود ہوا اور حرارت جذب کرتا تھا

مجھے اپنے دریافت ہونے کا انتظار میں کرنا ہے

ایک درخت کی دہشت

میں کلہاڑے سے نہیں ڈرا
نہ کبھی آرے سے
میں تو خود کلہاڑے کے پھل اور آرے کے دستے سے جڑا ہوں
میں چاہتا ہوں
کوئی آنکھ میرے بدن میں اترے
میرے دل تک پہنچے
کوئی محتاط آری
کوئی مشّاق ہاتھ مجھے تراش کر
ملاحوں کے لیے کشتیاں
اور مکتب کے بچوں کے لیے تختیاں بنائے

Scanned with CamScanner

اس سے پہلے
کہ میری جڑیں بوڑھی داڑھ کی طرح ہلنے لگیں
یا میری خشک ٹہنیاں آپس میں رگڑ کھا کر جنگل کی آگ بن جائیں

اندھا اور دوربین

جب اس نے پہاڑ کا نام لیا
تو سب ہانپنے لگے
جب اس نے خیمے کی نقل و حرکت بتائی
تو وہ کانپنے لگے
اس نے کہا اندھیرا
تو سب ایک دوسرے کو ٹٹولنے لگے
اس نے کہا دریا آبادی میں گھس آیا ہے
تو سب خلا میں ہاتھ پیر مارنے اور ڈوبنے لگے

تب وہ عیاری سے مسکرایا
اور انھیں بالوں سے پکڑ کر
خلا میں دو چار غوطے دیے
اور الگنی پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا

اب دیکھیں وہ انھیں کب اتارتا ہے

چرواہے کا خواب

چرواہا خواب دیکھتا ہے
اس کی ایک بھیڑ گم ہو گئی
صرف انچاس بھیڑیں باقی ہیں
چرواہا خواب دیکھتا ہے
اس کی تین بھیڑیں زخمی ہیں

صرف چھیالیس باقی ہیں
چرواہا خواب دیکھتا ہے
بھیڑیے نے اس کے گلے پر حملہ کر دیا
بھاگتی منتشر ہوتی بھیڑوں میں سے پیچھے رہ جانے والی ایک بھیڑ اور گم ہو گئی

پچاس خوف زدہ بھیڑیں دیکھتی ہیں
سوتے ہوئے چرواہے کو بھیڑیا گھسیٹ کر لے جا رہا ہے

دوسرا باغی

پریڈ سے نکالا ہوا آدمی
بے ترتیب پیر مارتا ہوا
پیچھے رہ گیا
دُھن بدستور جاری ہے
اور اس دھن پر
پریڈ میں شامل
سب ایک ساتھ پیر مارتے ہیں
ایک ساتھ قدم اٹھاتے ہیں
دھن بدستور جاری ہے
پریڈ سے نکالا ہوا آدمی
ایک انہماک کے ساتھ
بے ترتیب پیر مارنے میں مگن ہے
دُھن دھیمی ہو گئی ہے
یا دور ہونے لگی ہے
پریڈ والے پریڈ کر رہے ہیں
اور پریڈ سے باہر ایک آدمی ایک یقین کے ساتھ
کسی ترتیب میں حرکت کر رہا ہے
یا شاید پریڈ کر رہا ہے
کسی اور دھن پر
جو اس کے اندر بج رہی ہے

پریڈ کے لوگ شاید اب اپنی دھن نہیں سن رہے ہیں

Scanned with CamScanner

ان کے حروف کی ترتیب بدل گئی ہے
یا ان کی پریڈ کی دھن تبدیل ہو گئی ہے
سب الٹے سیدھے پیر مار رہے ہیں
پریڈ سے نکلا ہوا آدمی
پریڈ کر رہا ہے
ایک اور آدمی دھن سننے لگتا ہے
دو آدمی پریڈ کر رہے ہیں
دوسرا میں ہوں

جیتی ہوئی ہار

ایک بازی جیتنے کے لالچ میں
میں آخری بازی بھی ہار گیا
سب کچھ ہار جانے پر
ہارے ہوئی بازی کا تخمینہ نہیں لگانا چاہیے
لیکن مجھے اتنا یاد ہے
میں اپنی آخری بازی میں
جیتنے کا لالچ بھی ہار گیا تھا

مگر ایک روز میں دوبارہ جوئے خانے پہنچ گیا
تب میں نے اپنے خواب اور دن آزاد کرائے
اور اپنی عمر اور آنکھیں واپس جیت لیں
لیکن اس جیت میں
میں جیتنے کا لالچ پھر جیت گیا

میرے خواب

جہاں تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی
میرے خواب وہاں تک چلے جاتے ہیں
جہاں میرے قدم تھک جاتے ہیں
وہاں میرے خواب آگے چلنا شروع کر دیتے ہیں

جب تم میری رسائی سے دور ہو جاتی ہو
میرے خواب تمہیں چھو آتے ہیں
جس زمین پر میں شکست کھاتا ہوں
میرے خواب اسے اپنے مفتوحہ علاقے میں شامل کر لیتے ہیں
جب میں گم ہو جاتا ہوں
خواب مجھے ڈھونڈ نکالتے ہیں
جب میں قید ہو جاتا ہوں
خواب آہنی دروازوں اور خاردار تاروں سے باہر نکل جاتے ہیں
اور کسی کے ہاتھ نہیں آتے

چیونٹیاں

چیونٹیاں زمین پر کتنے کوس چلتی ہوں گی
اور کتنی ہمارے پیروں تلے آ کر مسل جاتی ہوں گی
اس کا شمار نہیں
لیکن جب یہ ہمارے بدن پر چلتی ہیں
تو ہم انہیں گن سکتے ہیں
ان کی مسافت کا اندازہ لگا سکتے ہیں

تم اپنے بدن پر کاٹتی چیونٹی کو کبھی الگ کرتے ہو
یہ چیونٹی بتا سکتی ہے
یا اس کی ٹوٹی ہوئی اصف
تم چیونٹیوں کے گھروں کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جان سکتے
کہ وہ دروازوں کی دہلیزوں یا دیواروں کی درازوں میں رہتی ہیں
یا رات بھر چلتی رہتی ہیں
لیکن تم یہ نہیں جان سکتے
یہ کہاں مل بیٹھتی ہیں
کہاں مشتبہ میٹنگیں کرتی ہیں
لیکن جب تم شہد کے مرتبان، شکر کی ڈبی یا گوشت کے ٹکڑے کی طرح

ن کے کھانے کا ڈھیر بن جائیں گے
سو رہ اُن گنت جمع ہو کر
تمہارے ان گنت ٹکڑوں کو آپس میں باندھ لیں گی
اور تمہیں دور دراز کی ریتوں اور دور دراز کی دراڑوں کے بے دردی سے دکھائیں گی
اور وہ گوشے بھی
جہاں انہوں نے خفیہ مینگنیں کی تھیں

انتخاب

میر مسعود

سعید الدین

کی نظموں کا پہلا مجموعہ

رات

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

اے

Scanned with CamScanner

تعارف

نومبر ۱۹۳۶ تاریخ پیدائش ہے (بہ مقام ادبستان لکھنؤ) ادبی تربیت والد مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے زیر سایہ ہوئی۔ گھر کے کتب خانے میں کلاسیکی ادب کی کتابیں تھیں۔ مکان سے متصل الطاف فاطمہ صاحبہ کا مکان تھا، ان کے یہاں بچوں کے رسالے "پھول" اور "پیام تعلیم" وغیرہ آتے تھے اور بچوں کی کتابوں کا بھی بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ مطالعے کا شوق ان دونوں کتب خانوں سے پورا ہوتا تھا۔ بچپن میں منظوم ڈرامے لکھتا تھا۔ کچھ چیزیں بچوں کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۵۷ میں فارسی ادب میں ایم اے کیا۔ پھر اردو اور فارسی میں پی ایچ ڈی کر کے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پڑھانے لگا، اور اب بھی پڑھا رہا ہوں۔ شمس الرحمان فاروقی کی دوستی ہو جانے سے دل چسپی کو مہمیز کیا۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی بیشتر انھی کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ سوا سو کے قریب مضامین وغیرہ اور چھوٹی بڑی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ افسانوں کی تعداد ایک درجن سے متجاوز نہیں ہے۔

۱۹۶۱ میں شادی ہوئی۔ چار بچے (ایک بیٹا تین بیٹیاں) ہیں۔"

نیر مسعود

نیر مسعود

وقفہ

گفتاتیم و گفتاتیم و بودی همه بود
خفتیم و شد سطور ما فسانهٔ احوال

ہمیشہ سے ہمارے خاندان میں پشتینی پیشے ہیں، بلکہ جہاں سے ہمارے خاندان کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کا ہمارے خاندان میں موجود ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی تاریخ ہمارے خاندان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

ہمارے خاندان کی تاریخ بہت مربوط اور قریب قریب مکمل ہے، اس لیے کہ میرے اجداد کو اپنے حالات محفوظ کرنے اور اپنا شجرہ درست رکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے خاندان کی تاریخ شروع ہونے کے وقت سے لے کر آج تک اس کا سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے، لیکن اس تاریخ میں بعض وقفے ایسے آئے ہیں

میرا باپ بڑا ہنرمند آدمی تھا اور معمولی پیشے کیا کرتا تھا۔ اسے کئی ہنر آتے تھے۔ بچپن میں تو مجھے یقین تھا کہ اسے ہر ہنر آتا ہے، لیکن اس کا اصل ہنر معماری کا تھا اور یہی اس کا اصل پیشہ بھی تھا۔ البتہ اگر موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اس کو معماری کا کام نہ ملتا تو وہ لکڑی پر نقاشی یا کچھ اور کام کرنے لگتا تھا۔

میری پرورش اسی کے زانوؤں پر ہوئی۔ آنکھیں کھولنے کے بعد میں نے مدتوں تک صرف اسی کا چہرہ دیکھا۔ مجھے اپنی ماں یاد نہیں، حالانکہ مجھے اس وقت تک کی باتیں یاد ہیں جب میں دودھ پیتا بچہ تھا۔ اس وقت میں روتا بہت تھا لیکن میرا باپ مجھے بہلانے کے بجائے مجھ کو اپنے زانو پر لٹائے خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہتا تھا یہاں تک کہ میں اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے آپ ہی آپ چپ ہو جاتا۔ ظاہر ہے میری پرورش سب اسی نے تنہا کی ہو گی اس لیے کہ اسے کام پر

Scanned with CamScanner

بھی جاتا ہوتا تھا، لیکن اس زمانے کی یادوں میں، جن کا کوئی بھروسا بھی نہیں، اپنے باپ کے سوا کسی اور چہرے کا نقش میرے ذہن میں محفوظ نہیں اور وہ بھی صرف اتنا کہ ایک بوڑھے دالان میں وہ گردن جھکائے چپ چاپ مجھے دیکھ رہا ہے اور مجھ کو اس کے چہرے کے ساتھ اونچی چھت نظر آ رہی ہے جس کی کڑیوں میں سرخ اور سبز کاغذ کی لمبی لمبی سجاوٹ جھول رہی ہے۔

جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو مجھے احساس ہونے لگا کہ میرا باپ دیر دیر تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ یہ اس کا ایسا معمول تھا کہ جلد ہی مجھ کو گھر سے اس کے جانے اور واپس آنے کے وقتوں کا اندازہ ہو گیا۔ میں ان دونوں وقتوں پر، بلکہ ان سے کچھ پہلے ہی، ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اس کے جاتے وقت میں صحن میں جمع ملبے کے ڈھیر میں سے اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اسے مارنے لگتا یہاں تک کہ پڑوس کی کوئی عورت دوڑ کر آتی اور مجھے گود میں اٹھا لیتی۔ ایسی عورتیں ہمارے مکان کے آس پاس بہت تھیں۔ جتنی دیر میرا باپ گھر سے باہر رہتا ان میں سے ایک دو عورتیں ہمارے پاس موجود رہتیں۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوتے تھے۔ باپ کے جانے کے کچھ دیر بعد میرا غصہ کم ہو جاتا اور میں بڑھیوں سے کہانیاں سننے یا بچوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جاتا، لیکن اس کی واپسی کا وقت قریب آتا تو میرا مزاج پھر بگڑنے لگتا تھا۔ اور جیسے ہی وہ گھر کے صحن میں قدم رکھتا، میں لپک کر اس کی طرف جاتا اور اسے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے مارنا شروع کر دیتا۔ اس وقت میرا باپ مجھ سے بھی زیادہ ہنگامہ کرتا اور اس طرح چیختا اور تڑپتا تھا گویا میں نے اس کی ہڈیاں توڑ پھوڑ کر رکھ دی ہیں۔ پھر میرا غصہ کم ہو جاتا اور میں اس کا علاج شروع کرتا۔ وہ بتلا بتلا کر مجھے بتاتا کہ اس کو کہاں کہاں پر چوٹیں آئی ہیں اور میں اس کے بدن کو کبھی دباتا، کبھی سہلاتا اور کہیں پر پھونکتا۔ اس کے فرضی زخموں سے بہتا ہوا فرضی خون پونچھتا اور خیالی شیشیوں سے خیالی دوائیں اس کے منہ میں انڈیلتا جن کی کڑواہٹ ظاہر کرنے کے لیے وہ ایسے برے برے منہ بناتا کہ مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

اس وقت تک، بلکہ اس کی آخری وقت تک، مجھے علم نہیں تھا کہ وہ میرا حقیقی باپ ہے، میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے خاندان کا کوئی پرانا ملازم ہے جس نے وفاداری کے ساتھ میری پرورش کی ہے اس طفلِ ... کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ خود اس پر تھی۔ اس کا برتاؤ میرے ساتھ واقعی ایسا تھا جیسے میں اس کا آقازادہ ہوں۔ اس لیے میرا برتاؤ اس کے ساتھ برا تھا، لیکن میں اپنے ... انداز میں اس سے محبت بھی کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کا بدن خراشوں سے کبھی خالی نہ رہتا تھا۔

جب میں کچھ اور بڑا ہوا تو اس کا گھر سے نکلنا مجھے اور زیادہ ناگوار گزرنے لگا۔ اب میں کبھی اس کے اوزاروں کا تھیلا چھپا دیتا، کبھی اس میں سے کچھ اوزار نکال کر ان کی جگہ اینٹیں یا لکڑی کے ٹکڑے رکھ دیتا۔ یہاں تک کہ اس نے تھیلا ایک مچان پر چھپا کر رکھنا شروع کر دیا اور جب میں اس مچان تک بھی پہنچنے لگا تو ایک دن تھیلا غائب ہو گیا۔ اس کے بعد کئی دن تک میرا باپ گھر سے باہر نہیں نکلا اور تیرے دالان کی سرخ سبز سجاوٹ والی چھت کے نیچے

بیٹھا لکڑی پر نقاشی کرتا رہا۔ اس میں اس کا انہماک ایسا تھا کہ میں اس کے کام میں مخل ہوتے ڈر رہا تھا، لیکن اس سے زیادہ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ جلد ہی وہ نقاشی کا کام چھوڑ دے گا اور اوزاروں کا تھیلا نکال کر پھر گھر سے باہر جانا شروع کر دے گا۔ اس لیے میں اس فکر میں لگ گیا کہ تھیلا تلاش کر کے اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دوں۔ اپنے باپ کو بتائے بغیر کہ مجھے کسی شے کی تلاش ہے، میں نے مکان کے ایک ایک حصے میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ مکان کے اندرونی دالانوں میں زیادہ تر دروازے مقفل تھے اور مجھے پتا نہیں تھا کہ ان کے پیچھے کیا ہے۔ پرانی وضع کے زنگ آلود قفلوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ انہیں مدت سے کھولا نہیں گیا ہے بلکہ ان کی کنجیاں بھی کب کی غائب ہو چکی ہوں گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ تھیلا ان دروازوں کے پیچھے نہیں ہے۔ لیکن مکان میں ایسے دروازے بھی بہت تھے جو مقفل نہیں تھے۔ ان کے پیچھے مجھے خالی کمرے اور کوٹھریاں نظر آئیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کا سامان ہٹا کر حال ہی میں ان کی مرمت کی گئی ہے۔ بعض بعض کے فرش پر تو ابھی پانی تک موجود تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میرا باپ گھر پر کس کس وقت معماری کا کام کرتا ہے۔ میں تعجب کرتا ہوا مکان کی مغربی دیوار کے قریب ایک بڑے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس دروازے کے دونوں پٹوں پر لکڑی کی دو مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے مکان میں کوئی ایسا دروازہ بھی ہے۔ میں دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا کہ اس کے پیچھے کیا ہو گا۔ مجھ کو یقین تھا کہ یہ کسی خالی کمرے کا دروازہ نہیں ہے۔ مزید جاننے کے لیے میں نے اسے تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔ اول اول مجھ کو صرف لکڑی کے لمبے لمبے مچان نظر آئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان مچانوں پر بہت بڑی بڑی کتابیں ترتیب کے ساتھ سجی ہوئی ہیں۔ میں نے ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ تاہم مجھے ان کتابوں میں کچھ دلچسپی سی پیدا ہوئی اور انھیں قریب سے دیکھنے کے لیے میں دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار کے قریب فرش پر بھی کتابیں ڈھیر ہیں۔ انھیں نزدیک سے دیکھنے کے لیے میں آگے بڑھا اور کتابوں کی طرف سے میری توجہ ہٹ گئی۔ ڈھیر کے اس طرف دیوار سے ملی ہوئی چٹائی پر ایک بوڑھا آدمی آنکھیں بند کیے چت پڑا ہوا تھا۔ پرانے کاغذوں کی خوشبو کے بیچ میں وہ خود بھی ایک بوسیدہ کتاب معلوم ہو رہا تھا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دور پر میرے باپ کی ہتھوڑی کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں چٹائی پر پڑے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے بالوں اور لباس سے وہ مجھے کچھ فقیر سا معلوم ہوا۔ میں اور غور سے دیکھنے کے لیے میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکا ہی تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک چپ چاپ مجھ کو تکتا رہا، پھر اس کے ہونٹ ہلے۔

"آؤ شہزادے،" اس نے کہا، "سبق شروع کیا جائے؟"

پاگل؟ میں نے سوچا، اور بھاگ کر اپنے باپ کے پاس آ گیا۔ وہ اسی طرح اپنے کام میں منہمک تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں چاندی کا ... اور داہنے ہاتھ میں ایک نازک سی ہتھوڑی تھی۔ لکڑی کی ایک ہشت پہل تھالی اس کے سامنے تھی جس پر اس نے طرح طرح

Scanned with CamScanner

سے مری عمر میں یہاں ابھارے نہیں اور اب ان پتیوں کی باریک رگوں میں چاندی کے تار بھر رہا تھا۔
مجھے اپنے قریب محسوس کر کے اس نے گردن اٹھائی اور آہستہ سے مسکرایا۔

"آئیے" وہ دھیرے سے بولا "کہاں گھوم رہے تھے آپ؟"

"وہاں ۔۔۔ وہ بڈھا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو آپ نے اپنے استاد کو ڈھونڈھ نکالا" وہ بولا اور پھر پتوں کی رگوں میں تار بٹھانے لگا۔

"استاد؟" میں نے پوچھا۔

"لیکن آپ ڈھونڈھ کیا رہے تھے؟" جواب میں اس نے بھی پوچھا اور مجھے یاد آ گیا۔

"تھیلا ۔۔۔" میں نے کہا، "اوزاروں کا تھیلا کہاں ہے؟"

"وہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

اب مجھے غصہ آنے لگا

"کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"نہیں ملے گا۔"

مجھے اور غصہ آیا، لیکن اسی وقت اس نے پوچھا،

"آج کون دن ہے؟"

میں نے اسی غصے میں بتا دیا اور پھر پوچھا،

"تھیلا کہاں ہے؟"

"پرسوں سے آپ کا سبق شروع ہو گا۔" اس نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔ میں نے اسے برا بھلا کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔ دیر تک وہ میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور افسردگی کی ایسی آمیزش تھی کہ میں اپنا سارا غصہ بھول گیا۔ اس کی مضبوط انگلیاں میری کلائی اور شانے میں گڑی جا رہی تھیں اور بدن دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس حالت میں وہ مجھے ہمیشہ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔

"چھوڑ دیجیے" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور لکڑی کی منقش تھالی پر ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ ایک پتی کی رگ میں بیٹھا ہوا تار تھوڑا اکھڑ گیا اور میرے باپ نے جلدی سے مجھے چھوڑ دیا۔ اس کی انگلیوں میں لپٹے ہوئے تار نے میری کلائی پر جالی کا سا نقش بنا دیا تھا۔ میں نے کلائی اس کی آنکھوں کے سامنے کی۔ وہ تار کے نقش کو دیر تک سہلاتا اور پھونکتا رہا، پھر بولا،

"پرسوں سے" اور پھر بولا "پرسوں سے"

*

سبق شروع ہونے کا خیال مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا تھا اس لیے دوسرے دن میں اپنے باپ سے خفا خفا سا رہا۔ لیکن شام ہوتے ہوتے مجھے اپنے استاد کے بارے میں تجسس پیدا ہوا، اور تیسرے دن میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے گڈریے... احتیاط کے ساتھ مچھلیوں والے دروازے میں داخل ہوا۔ استاد چٹائی پر دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔ باپ نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا اور خود فرش پر ڈھیر کتابوں کو اٹھا اٹھا کر طاقوں پر سجانے لگا، یہاں تک کہ فرش پر صرف ایک کتاب پڑی رہ گئی۔

"میں آپ اٹھائیے شاباش؟" اس نے مجھ سے کہا۔ مجھے یہ سب ایک دلچسپ تماشا معلوم ہو رہا تھا۔ کتاب کا وزن زیادہ تھا، تاہم میں نے اس کو اٹھا لیا اور باپ کے اشارے پر اپنے استاد کے سامنے رکھ دیا۔ استاد کتاب پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے مسکرایا اور مجھے حیرت ہوئی کہ پرسوں وہ مجھ کو فقیر کیوں معلوم ہوا تھا۔

"اسے کھولو، شہزادے" اس نے کہا۔

کتاب کے چند ابتدائی صفحوں کو چھوڑ کر باقی ورق سادہ تھے۔ اس دن پہلے سادہ ورق پر استاد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کچھ لکھوایا۔ اتنی بڑی سی کتاب پر اپنے ہاتھ کی تحریر مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میں چاہتا تھا استاد مجھ سے کچھ اور لکھوائے لیکن میرے باپ نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔ اس کا بدن پھر دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اسی حالت میں دیر تک وہ استاد سے چپکے چپکے باتیں کرتا رہا۔ لیکن وہ دونوں معلوم نہیں کن اشاروں میں گفتگو کر رہے تھے کہ میری سمجھ میں ان کی ایک بات بھی نہیں آئی اور میں اپنے باپ کے ہاتھوں کے حلقے میں گھرا ہوا طاقوں پر سجی بڑی بڑی کتابوں پر نظریں دوڑاتا رہا۔ آخر میرا باپ مجھے لے کر باہر آ گیا۔

اس کے بعد سے میرا زیادہ وقت استاد کے ساتھ گزرنے لگا اور میں اپنے باپ کو بھول سا گیا، یہاں تک کہ کچھ دن تک مجھے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ اس نے پھر سے اوزاروں کا تھیلا لے کر کام پر جانا شروع کر دیا ہے۔ مچھلیوں والے دروازے کے پیچھے موٹی کتابوں میں گھرا ہوا استاد مجھے ہر وقت موجود ملتا تھا۔ وہ شاید وہیں رہتا تھا۔ میں اکثر اسے دیکھتا کہ فرش پر ڈھیر کتابوں کے پاس آنکھیں بند کیے چپ پڑا ہے اور فقیر معلوم ہو رہا ہے۔ میری آہٹ سن کر وہ آنکھیں کھولتا اور ہمیشہ ایک ہی بات کہتا،

"آؤ، شہزادے، سبق شروع کیا جائے۔"

لیکن اس نے مجھے پڑھایا کچھ نہیں۔ البتہ لکھنا بہت جلدی سکھا دیا۔ ہر روز لکھنے کی باقاعدہ مشق کرانے کے بعد مجھے اپنے سامنے بٹھا کر وہ بولنا شروع کرتا۔ کسی کسی دن وہ مجھے پرانے وقتوں اور دور دراز کے علاقوں کی دلچسپ باتیں سناتا، لیکن زیادہ تر وہ میرے اپنے شہر کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ وہ شہر کے مختلف محلوں میں بسنے والے خاندانوں کا حال سناتا تھا کہ کس محلے کا کون خاندان کس طرح آگے بڑھا اور کیونکر تباہ ہوا اور اب اس خاندان میں کون کون لوگ باقی ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یہ دلچسپ قصے تھے لیکن استاد انہیں بیدلی سے بیان کرتا تھا اس لیے وہ مجھے محض بےربط ٹکڑوں کی طرح یاد رہ جاتے تھے۔ البتہ شہر کے محلوں کا ذکر وہ اس انداز سے کرتا تھا کہ ہر محلہ مجھے ایک انسان نظر آتا تھا جس کا مزاج اور کردار ہی نہیں، صورت شکل بھی دوسرے محلوں سے مختلف ہوتی تھی۔ خوش ہو کر استاد یہ دعویٰ بھی کرنے لگتا تھا کہ وہ شہر کے کسی بھی آدمی کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کس محلے کا رہنے والا ہے یا کن کن محلوں میں رہ چکا ہے۔ اس وقت میں اس کے اس دعوے پر ہنستا تھا لیکن اب دیکھتا ہوں کہ خود مجھ میں یہ صفت کچھ کچھ موجود ہے۔

کبھی کبھی استاد باتیں کرتے کرتے چٹائی پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور میں فرش پر

Scanned with CamScanner

ڈھیر کتابوں کے ورق الٹنے پلٹنے لگا۔ انھیں ورق گردانی میں مجھے معلوم ہوا کہ میں پڑھ بھی سکتا ہوں۔ لیکن جانے کیا لکھی ہوئی وہ بھاری بھاری کتابیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ان میں سے تو میری اپنی زبان ہی میں نہیں تھیں۔ بعض کی عبارتیں اور بعض کی تحریریں اتنی گنجلک تھیں کہ بہت غور کرنے پر بھی ان کا بالکل دھندلا سا مفہوم میرے ذہن میں آتا اور فوراً نکل جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے اپنے استاد پر غصہ آنے لگتا اور کئی مرتبہ میں نے اس سے بڑی بدتمیزی کے ساتھ بات کی۔ ایک بار وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا میری باتیں سن رہا تھا کہ اچانک میرے سر کے اندر چمک سی ہوئی۔ میں نے چلا کر کہا:

"بہرا ہو گیا ہے، کتیا؟" اور ایک بھاری کتاب اٹھا کر اس کے سینے پر پھینک دی۔

اس کے دوسرے دن مجھے اپنے مکان کے قریب کی ایک چھوٹی سی درس گاہ میں بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد میں شہر کی مختلف درس گاہوں میں پڑھتا رہا۔ شروع شروع میں میرا باپ بڑی پابندی کے ساتھ مجھ کو درس گاہ تک پہنچاتا اور وہاں سے واپس لاتا تھا۔ چھٹی ہونے پر میں باہر نکلتا تو دیکھتا کہ وہ درس گاہ کے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ، میری کتابیں سنبھالتا اور کبھی کبھی مجھ کو بھی گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا لیکن میں اسے نوچ کھسوٹ کر الگ ہو جاتا تھا۔ اگر کسی دن اسے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں خوشی خوشی سیر کرتا ہوا تنہا گھر لوٹتا اور دوسرے دن اکیلے جانے کی ضد کرتا تھا۔ آخر رفتہ رفتہ میں نے تنہا جانا اور واپس آنا شروع کر دیا۔ پھر میں خالی وقت اور چھٹی کے دنوں میں بھی گھر سے باہر نکلنے لگا اور اسی زمانے میں اچھی بری صحبتوں سے بھی آشنا ہوا۔ میں نے شہر کے ان تمام محلوں کے چکر لگائے جن کے بارے میں استاد بتاتا تھا کہ کون ریاکار ہے کون بزدل کون چاپلوس اور کون فسادی۔ انھیں گردشوں کے دوران ایک دن میں نے اپنے باپ کو بازار میں دیکھا۔

وہ بازار کے اس حصے میں کھڑا ہوا تھا جہاں ہر روز صبح کے وقت مزدور اور کاریگر کام کی تلاش میں آکر جمع ہوتے تھے۔ اوزاروں کا تھیلا زمین پر رکھے دونوں ٹخنوں کے بیچ میں رکھے وہ پاس کے لوگوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ تھیلا زمین پر چھوڑ کر وہ لپکتا ہوا میری طرف آیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"کوئی بات ہو گئی ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے پھر کہا۔

"ہمیں دیکھنے آئے تھے؟" اس نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولا: "ایسا ہی ہے تو ہمیں کام پر دیکھو۔" پھر وہ آہستہ سے ہنسا۔

اسی وقت کسی مزدور نے اس کا نام لے کر پکارا اور وہ اپنے تھیلے کی طرف لوٹ گیا جہاں

دھوپ میں کی ایک شخص اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے میرے باپ سے کچھ پوچھا۔ پھر دیر تک اسے کچھ سمجھاتا رہا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ہوا میں محراب یا گنبد کی سی شکل بناتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں بڑے بڑے نگینوں والی کئی انگوٹھیاں تھیں جنھیں وہ جلدی جلدی انگوٹھے سے گھماتا تھا۔ بہت سی آوازوں کے بیچ میں اس کی دھیمی کھرکھراتی ہوئی آواز صاف سنائی دے رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد میرے باپ نے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا اور اس شخص کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس کے تھیلے میں کسی اوزار کی جگہ میرا رکھا ہوا لکڑی یا اینٹ کا ٹکڑا نہیں ہو گا۔ لیکن اس خیال سے مجھ کو خوشی کے بجائے کچھ افسردگی سی محسوس ہوئی۔ اس افسردگی پر مجھے تعجب بھی ہوا۔ میں سیدھا گھر واپس آ گیا۔ اور اگرچہ وہ پورا دن میں نے استاد کے ساتھ فضول بحثوں میں گذارا، لیکن تمام وقت مجھے گھر میں باپ کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ یہ خیال بھی مجھے بار بار آیا کہ میں نے ابھی تک اس کو معماری کا کام کرتے نہیں دیکھا ہے اور یہ مجھے اپنی بہت بڑی کوتاہی معلوم ہوئی مگر اس کی تلافی کا خیال مجھے نہیں آیا۔

ایک دن سہ پہر کے قریب گھومتا پھرتا میں اپنی ایک پرانی درس گاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ درس گاہ مدتوں پہلے ایک تاریخی عمارت میں قائم کی گئی تھی اور اب بھی اسی عمارت میں تھی۔ عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور جب میں وہاں پڑھتا تھا تو اس کی ایک چھت بیٹھ گئی تھی جس کے بعد میرے باپ نے مجھے اس درس گاہ سے اٹھا لیا۔ اس سے کچھ دیر پہلے تک میں اسی چھت کے نیچے تھا۔ اتنے دن بعد ادھر آیا تو میں نے دیکھا کہ درس گاہ کی ٹوٹی ہوئی چاردیواری درست کر دی گئی ہے۔ لکڑی کا وہ بیرونی پھاٹک غائب تھا جس کے پٹوں میں لوہے کے پھول جڑے ہوئے تھے اور بائیں پٹ میں بیچ کی طرف چھوٹے سے ایک پٹ کا دروازہ تھا۔ اب اس پھاٹک کی جگہ لوہے کا کٹہرے دار پھاٹک تھا جس کے پیچھے اصل عمارت میں داخلے والی اونچی محراب نظر آ رہی تھی۔ محراب کے پیچھے لوگ چل پھر رہے تھے۔ حالانکہ وہ چھٹی کا دن تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید ان لوگوں میں کوئی میری جان پہچان والا مل جائے میں پھاٹک سے گذر کر محراب کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ محراب کی پیشانی پر بالکل ویسی ہی دو مچھلیاں ابھری ہوئی ہیں جیسی میرے مکان میں استاد والے کمرے کے دروازے پر ہیں۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس درس گاہ میں اتنے دن تک آنے جانے کے باوجود ان مچھلیوں پر کبھی میری نظر نہیں پڑی۔ اب میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ محراب کی شکستہ پیشانی کی مرمت کی جا چکی تھی۔ مچھلیاں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ داہنی طرف والی مچھلی کی دم غائب تھی۔ اس کی جگہ نیا خارجی مسالا بھر دیا گیا تھا اور میرا باپ دو آڑی بلّیوں پر ٹکا ہوا اسی مسالے کو مچھلی کی دم کی شکل میں تراش رہا تھا۔ وہ سر پر ایک کپڑا لپیٹے ہوئے تھا جس کی وجہ سے میں اسے پہچان نہیں سکا۔ میں نے اسے اس کے تھیلے سے پہچانا جو محراب کے داہنے پائے سے لٹکا ہوا رکھا تھا اور اس میں سے کچھ اوزار باہر جھانک رہے تھے۔ دیر تک اسے اپنے کام میں کھویا ہوا دیکھتے رہنے کے بعد میں نے زمین پر سے پرانے ٹوٹے ہوئے مسالے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف اچھالا۔ ٹکڑا اس کے پیر کے پاس بلّی سے ٹکرا کر واپس گرا اور اس نے نیچے کی

Scanned with CamScanner

طرف دیکھا، آہستہ سے ہنسا، پھر بولا:

"تو آپ نے ہم کو ڈھونڈ نکالا؟"

مجھے اس کی آواز شکستہ مچھلی کے کھلے ہوئے منھ سے آتی معلوم ہوئی۔ وہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ابھی کتنی دیر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وقت تو ہو چکا،" اس نے بتایا۔ "کام تھوڑا باقی ہے، زیادہ دیر نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد وہ سیڑھی اترا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے اوزار تھے جنھیں اس نے قریب ہی بنے ہوئے ایک عارضی حوض میں ڈبویا۔ مٹی پر لپٹا ہوا کپڑا کھول کر اس سے اوزاروں کو پونچھا اور میری طرف دیکھ کر تھکے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ میں نے اوزار اس سے لے کر تھیلے میں رکھ دیے اور ہم دونوں ساتھ ساتھ گنبددار پھاٹک کی طرف چلے۔ آدھا راستہ طے کر کے وہ رک گیا۔ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اس نے اپنے دن بھر کے کام کو دیکھا، پھر پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔

چوتھے یا پانچویں دن میں نے اسے تھیلا لے کر گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو پوچھا:

"آج کہاں کام لگا ہے؟"

"وہیں،" اس نے کہا، پھر بولا، "آج بھی دیر میں لوٹنا ہو گا۔"

لیکن اس دن دوپہر سے ذرا پہلے کچھ طالب علموں کے جھگڑے میں محراب سے لگی ہوئی بلّیاں اس طرح ہلیں کہ میرے باپ کا توازن بگڑ گیا اور وہ مچھلیوں کی اونچائی سے درس گاہ کے سنگی فرش پر آ گرا۔

اس وقت میں گھر ہی پر تھا اور استاد سے کسی فضول بات پر بحث کر رہا تھا۔ دو تین مزدور اسے سہارا دے کر لائے۔ انھوں نے اپنی دیہاتی بولی میں حادثے کی مبہم سی تفصیل بتائی اور کام پر واپس چلے گئے۔ اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرب میں ہے۔ میں نے اور استاد نے اسے بستر پر لٹا دیا۔

کئی دن تک میرا باپ چپ چاپ بستر پر پڑا رہا اور میرا استاد چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ پڑوس کی ... حال پرسی ... دونوں کی خبر گیری کرتی رہیں۔ میں اس عرصے میں کئی بار گھر سے باہر نکلا لیکن تھوڑا ہی دور جا کر واپس آ گیا۔

ایک دن واپس آتے ہوئے مجھے اس محراب اور اس کی پیشانی کی شکستہ مچھلیوں کا خیال آیا اور میں درس گاہ کی طرف لوٹ گیا۔ وہ بھی چھٹی کا دن تھا۔ میں محراب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک مچھلی درست ہو چکی تھی۔ اس کی پشت پر سفنوں کا جال اس طرح تراشا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک ایک سفنے کو الگ الگ ڈھال کر مچھلی کے بدن میں بٹھایا گیا ہے۔ ہر سفنا بیچ میں ہلکا سا ابھرا ہوا، کناروں پر دھنسا ہوا اور ... میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ مچھلی کی آنکھ کی جگہ ایک گول سوراخ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مچھلی منھ کھولے ہوئے مجھے گھور رہی ہے۔ میں نے اس پر سے نظر ہٹا لی۔

دوسری مچھلی کا سارا ... مسالا ... دب گیا تھا اور اب اس کے ... کی بتی ... شکل میں ابھری رہ گئی تھیں، لیکن ان ابھری ہوئی لکیروں سے بھی ایک مچھلی کی

حالانکہ سب ... مچھلی کے ... کی وجہ سے محراب کی پیشانی ... بیچ ... شکل ... معلوم ہوتی تھی ... اسی طرح لگی ہوئی تھیں ... کو پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ اس کی ... سیڑھی پر ... ہوئی ... ساتھ محراب سے ٹکرائی یہ اور بھی ... مچھلی کے کھلے ہوئے منھ سے ... محسوس ہوئی۔ پھر یہ آواز ایک انسانی آواز میں بدل گئی جو دیہاتی بولی میں میرے باپ کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ اسی وقت میری نظر محراب کے نیچے کھڑے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ یہ انھیں مزدوروں میں سے ایک تھا جو میرے باپ کو گھر لائے تھے۔ میں نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا اور وہ دیر تک میرے باپ کی کاریگری کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس میں اس نے معماری کی کئی ایسی اصطلاحیں استعمال کیں جن کے مفہوم سے میں واقف نہیں تھا۔ پھر اس نے شہر کی بعض مشہور تاریخی عمارتوں کے نام لیے جن کی مرمت اور درستی میں وہ میرے باپ کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بتایا اور تاکید کی کہ میں اپنے باپ کو بتا دوں کہ اس نام کا مزدور ... پوچھ رہا تھا۔ پھر مجھے ... رکنے کا اشارہ کر کے وہ پاس کی ایک کوٹھری میں داخل ہوا اور میرے باپ کا تھیلا لیے ہوئے باہر آیا۔ تھیلا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے ... سانس کھینچی۔ وہ میرے باپ سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ... لمبی سانس کھینچنے کے بعد وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ درس گاہ کے اندرونی حصوں سے کسی نے اس کو آواز دی۔ ... محراب میں داخل ہوئے اور بائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ ... میں ... کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور اگرچہ میری نظریں زمین پر تھیں لیکن مجھے پھر محسوس ہوا کہ داہنی طرف والی مچھلی منھ کھولے ہوئے اپنی آنکھ کے سوراخ سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اوزاروں کو تھیلے میں ٹھیک سے رکھا اور درس گاہ کے گنبددار پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ گھر پہنچ کر تھیلا میں نے استاد والے کمرے میں کتابوں کے ایک ڈھیر پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

... دالان میں بستر پر میرا باپ اسی طرح چپ چاپ لیٹا ہوا اور استاد اسی طرح چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔

٭

درس گاہ میں گرنے کے بعد میرا باپ پھر کام پر نہیں جا سکا بلکہ بستر سے اٹھ بھی نہ سکا۔ کچھ دن تک وہ اس طرح گم سم پڑا رہا کہ خیال ہوتا تھا اسے دماغی چوٹ آئی ہے اور وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا ہے لیکن ایک دو دفعہ میں نے چاہا کہ اس کا بستر کتابوں والے کمرے میں کر دوں تو اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوا کہ وہ اس دالان سے ہٹنا نہیں چاہتا جہاں ... تک اس نے ہر موسم گزارا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے دیہاتی بولی میں بولنا شروع کیا۔ ایک دن اس نے مجھ کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور استاد جو اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا اٹھ کر کتابوں والے کمرے میں چلا گیا۔

"میرا کام ختم ہو گیا ہے،" وہ مجھے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ مجھے اس کا گردن موڑ کر پیچھے ... دن بھر کے کام کو دیکھنا یاد آیا اور میں ... اس کے سرہانے بیٹھ کر ...

اسے زانو پر رکھ لیا۔

"ایک مچھلی ابھی باقی ہے" میں نے گردن جھکا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ بولے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے چہرے کی سمت چھت کی کڑیوں سے جھولتی ہوئی سجاوٹ نظر آئی، یا شاید یہ میرا صرف وہم تھا۔ اسی وقت اس نے اپنی گردن موڑ لی اور بولا

"مجھے بٹھا دو۔"

کئی تکیوں کے سہارے بیٹھنے کے بعد وہ کسی خیال میں ڈوب گیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے … معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت کئی تکیوں سے ٹیک لگائے … کے صاف ستھرا لباس پہنے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اسی وقت پہلی بار مجھے خفیف سا شبہ ہوا کہ وہ میرا … باپ ہے۔

"جب صرف یہ مکان اور تم باقی رہ گئے" اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تو میں نے سوچا اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کہانی سنانے والا ہے، لیکن وہ خاموشی کے ساتھ چھت کو گھورتا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر دوسری طرف گردن موڑ کر بولا

"چلو، کہیں گھوم آئیں۔"

"جی نہیں چاہتا"، میں نے کہا۔

اس نے میرا شانہ پکڑ … اپنی طرف کھینچا۔ اس کی گرفت کمزور … اور ہاتھ میں لرزش تھی۔

"سامان کم رہ گیا تھا" اس نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ "میں نے اسے اور کم نہیں ہونے دیا۔ تمہیں وہ بہت معلوم ہو گا۔"

مجھے زنگ آلود قفلوں والے بند دروازے یاد آئے۔ میں نے کہا

"سامان مجھ کو نہیں چاہیے۔"

"میں نے اس میں کچھ بڑھایا بھی ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"اسی میں کہیں وہ بھی ہو" اس نے کہا۔ "میں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ تم ڈھونڈ لینا"، پھر کچھ رک کر بولا "وہ کتابوں میں بھی ہو گا۔" یہ کہتے کہتے اس کی حالت کچھ بگڑ گئی۔ میں دوڑ کر … کے کمرے میں گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی … اور میں اسے ہاتھ پکڑ کر … باپ کے بستر تک لایا۔ اس نے گردن گھما کر استاد کو دیکھا، پھر مجھے، میری طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی ناہموار سانسوں پر قابو پایا اور بولا

"اسے الگ مت کرنا، وہ ہمارا نشان ہے۔"

میں نے استاد کی طرف دیکھ کر اشارے سے پوچھا کہ میرا باپ کس چیز کا ذکر کر رہا ہے، لیکن استاد اسی طرح گم سم بیٹھا تھا جیسے نہ کچھ سن رہا ہو نہ دیکھ رہا ہو۔ البتہ میرے باپ کی آنکھیں، جن کی چمک ماند پڑ گئی تھی، کچھ دیکھتی معلوم ہو رہی تھیں۔

"وہ کیا چیز ہے؟" میں نے اس پر جھک کر پوچھا۔

"اس کی … خاندان میں … رہا ہے" وہ دھیمی آواز میں بولا اور اس کی … اکھڑ گئی۔ اس کی سانس جو ہموار ہو چلی تھی پھر ناہموار ہو گئی۔

استاد اسی طرح گم سم بیٹھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے باپ کے دونوں کندھے پکڑ لیے۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کا حقیقی بیٹا ہوں، اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہہ کے پکاروں، اس لیے میں اس کے کندھے پکڑے خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت اپنے آپ سنبھل گئی اور وہ بالکل ٹھیک معلوم ہونے لگا۔ اس نے بہت صاف اور متوازن آواز میں کہا

"چلو، گھوم آئیں۔"

اس بار میں انکار نہیں کر سکا اور اس کے کندھے چھوڑ کر مکان سے باہر نکل آیا۔

میرا باپ بہت دن زندہ نہیں رہا۔ آخری دنوں میں وہ زیادہ تر خاموش پڑا رہتا تھا۔ صرف کبھی کبھی … کر … پر … نہیں تھا کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ ایک بار غصے میں میں نے بہت اصرار سے پوچھا اور اس کے خاموش رہنے پر خود کو غصے میں ظاہر کیا تو اس نے صرف اتنا بتایا

"کچھ نہیں۔"

اس کے دوسرے یا تیسرے دن دوپہر کے وقت میں … کہ استاد نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ میرا باپ ختم ہو گیا ہے، لیکن جب میں دوڑتا ہوا اس کے بستر کے پاس پہنچا تو وہ مجھے زندہ ملا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور میرا شانہ پکڑ کر جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ میں ٹھیک سے سننے کے لیے اس پر جھک گیا پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہت جھک کر سننے پر صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ وہ تتلا کر بول رہا ہے۔ اسی وقت وہ بے ہوش ہو گیا، اور اسی بیہوشی میں کسی وقت اس کا دم نکل گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد دیر تک میں … پر … رہا۔ میں نے … سنجیدگی کے ساتھ اس کی … انتظامات کے سلسلے میں استاد سے صلاح مشورہ کیا اور ہر بات کا خود فیصلہ کیا۔ لیکن جب وہ انتظام شروع ہو گئے تو میرے سر کے اندر کوئی چیز بدلی اور مجھ پر ایک جوش طاری ہو گیا۔ میں نے اسی جوش میں فیصلہ کر لیا کہ موت میرے باپ کی نہیں، میری ہوئی ہے، پھر یہ فیصلہ کیا کہ باپ بھی میں خود ہی ہوں۔ پھر مجھ کو یہ دونوں فیصلے … معلوم ہونے لگے اور میں نے عجب واہیات حرکتیں کیں۔ صحن سے اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر … میں پھینکے اور خود کو … شروع کر دیا۔ میرے باپ کا مردہ نہلانے کے لیے جو پانی بھرا گیا تھا اس میں میں نے کچھ … ملا دیا۔ اس کے بدن پر لپیٹنے کے لیے جو سفید کپڑا … کیا تھا اسے کھول کر خود … پہن لیا اور جب اسے لے کر جانے لگے تو اس میں پھر ایسی ایسی رکاوٹیں ڈالیں کہ … زمین پر گرتے گرتے

Scanned with CamScanner

کھڑے رہے اور اس کے ساتھ کی چھوکری دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجاتی رہی، الجھے ہوئے بالوں میں اس کے بڑھے ہوئے ناخنوں کی رگڑ سے کھرکھراہٹ کی ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جسے سن کر مجھے بہت [illegible] وہ شخص یاد آ گیا جو میرے باپ کو [illegible] ساتھ لے گیا تھا پھر مجھے باپ کے [illegible] اور استاد نے مجھ کو واپس [illegible] آیا۔

"میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا [illegible] میری طرف اس طرح دیکھتا رہا جیسے مجھ سے کسی بات کی توقع کر رہا ہو [illegible] کبھی کبھی دیکھنے لگتا تھا جس پر مجھے [illegible] اس وقت بھی مجھے [illegible] محسوس ہوئی اور میں نے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے مڑ کر چھوکری کے کندھے پر ہاتھ رکھا

[illegible] اس نے چھوکری کو ساتھ لیا اور اس کے پیچھے دھیرے دھیرے چلتا ہوا واپس ہو گیا۔

جب وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو مجھے خیال آیا کہ میں نے استاد سے گھر کے اندر چلنے کو نہیں کہا۔

مجھے [illegible] کا گھر نہیں معلوم تھا۔ [illegible] لیکن جب میں ان بستیوں پر پہنچا تو وہاں کوئی استاد کا جاننے والا نہ ملا۔ میں نے اس کی تلاش میں کئی دن صرف کیے۔ [illegible] اس طرح ایک بار پھر میں نے قریب قریب پورے شہر کا چکر لگا لیا۔ اس گردش میں اپنے شہر کی تاریخی عمارتوں کو میں نے خاص طور پر دیکھا۔ میں نے ان عمارتوں کی مرمت شدہ حصوں کا غور سے جائزہ لیا اور ان میں کئی جگہ مجھے اپنے باپ کا ہاتھ نظر آیا۔ ان عمارتوں کے کسی نہ کسی [illegible] پر مجھے مچھلیاں ضرور بنی ہوئی نظر آئیں۔ [illegible] اور ہر مچھلی مجھے اپنے باپ کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ہر شکستہ مچھلی کو دیکھ کر مجھے اپنی درس گاہ کی محراب پر بنی ہوئی مکمل مچھلی یاد آتی تھی۔

انھی دنوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ مچھلی میرے شہر کا نشان ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے [illegible] معمے کا حل دریافت کر لیا ہے، لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ حل اس معمے سے بھی زیادہ مبہم ہے۔ اپنے باپ کا خیال مجھ کو بار بار [illegible] کی طرف بڑھتے بڑھتے میں [illegible] گھر پہنچ کر میں نے [illegible] چھت کی کڑیوں میں [illegible] کی سجاوٹ جھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا [illegible] مرمت ہوئی ہے اور چھت میں جگہ جگہ نیا مسالا بھر گیا ہے لیکن چھت کا وہ حصہ جس پر یہ سجاوٹ تھی بے مرمت رہ گیا تھا [illegible] دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ بہت جلد گرنے والا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی گر

بچھڑ جانے پر اتنا ہنگامہ کیا کہ لوگ اس کے مرنے پر افسوس ظاہر کرنا بھول گئے۔ آخر مجھے [illegible] پکڑ کر واپس لایا گیا اور گھر میں بند کر دیا گیا۔ [illegible] کچھ دیر کے لیے میں اپنے باپ کی موت کو بھول گیا [illegible] بالکل خلاف مجھے [illegible] آ گئی۔

میں دوسرے دن تک سوتا رہا۔ میں نے کئی خواب بھی دیکھے لیکن ان کا میرے باپ یا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

[illegible] دن تک میں کھویا کھویا سا رہا۔ استاد دن میں کئی بار آتا اور کچھ دیر تک مجھے [illegible] کے ساتھ دیکھتے رہنے کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ چوتھے دن مجھے یاد آیا کہ میرے باپ نے مجھ سے کچھ ڈھونڈنے کو کہا تھا۔ [illegible] گھر میں اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ [illegible] ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ اسی میں میری نظر [illegible] کتابوں کے ڈھیر پر [illegible] اوزاروں کے تھیلے پر پڑی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا، دیر تک بیٹھا رہا اور رات ہوتے ہوتے وہیں سو گیا۔

اس رات میں نے خواب میں اپنے باپ کو دیکھا کہ درس گاہ کی محراب کے آگے کھڑا ہوا ہے اور گردن موڑ کر [illegible] درست کی ہوئی مچھلی کو دیکھ رہا ہے اور مچھلی کی آنکھ چمک رہی ہے اور وہ بھی میرے باپ کو دیکھ رہی ہے۔

دوسرے دن میں نے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا، گھر سے نکلا اور بازار میں اپنے باپ کی جگہ پر [illegible] دیر ہو گئی تھی اور سب لوگ وہاں سے جا چکے تھے پھر بھی میں بہت دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا اور کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی، یہاں تک کہ میرا استاد مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر واپس لے آیا۔ راستے میں جب اس نے مجھ کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو میں نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

کئی دن تک اسی طرح استاد سے میرا جھگڑا چلتا رہا۔ آخر اس نے میرے یہاں آنا چھوڑ دیا، لیکن [illegible] پابندی سے پہنچاتا رہا۔ [illegible] گرد چھوکریاں اور [illegible] کھانے کی پوٹلی میرے ہاتھ میں تھما کر چپ چاپ لوٹ جاتیں۔ مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ کھانا لانے والی ایک چھوکری کے پیچھے [illegible] کے کندھے پر ہاتھ رکھے میرا استاد کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھا [illegible] کچھ دیر تک خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا، پھر اپنے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولا

"اب میں ختم ہو رہا ہوں۔"

اس دن میں نے روشنی میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تھا اور وہ ہمیشہ سے زیادہ فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں بغیر کچھ بولے آمنے سامنے

Scanned with CamScanner

جائے، اور چٹائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت مکان کے صدر دروازے پر کسی نے دستک دی۔

آخری بار استاد کی مٹی لانے والی چھوکری دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سر کھجاتی جا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا قسمتی پھل تھا جس پر وہ اِدھر اُدھر دانت لگا رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا

وہ کچھ دیر تک پھل پر منہ مارنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرتی رہی، پھر بولی:

"طاہرہ بی بی نے کہلایا ہے، آپ کے استاد نہیں رہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے وہم ہوا کہ استاد میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔ میں دیر تک چھوکری کی طرف دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ شرمانے لگی۔

"کب؟" آخر میں نے پوچھا

"کئی دن ہو گئے۔ ہم تین چار آئے، آپ نہیں تھے۔"

"ان کے گھر میں کون کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"استاد کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔"

"ان کی دیکھ بھال کون کرتا تھا؟"

"طاہرہ بی بی آ جاتی تھیں۔"

"طاہرہ بی بی ان کی کون ہیں؟"

"پتا نہیں۔"

"وہ رہتی کہاں ہیں؟"

"طاہرہ بی بی؟ پتا نہیں۔"

اس کے بعد وہ واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے صدر دروازہ بند کر لیا اور مڑ رہا تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ چھوکری سامنے کھڑی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں پھل کی جگہ سرخ کپڑے کا گولا سا تھا۔

"ہم بھول گئے تھے۔ اس نے مجھے بھیجی ہیں۔" گولا میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ رکھ بھیجی کنجیاں ہیں۔"

"کیسی کنجیاں؟"

"پتا نہیں، طاہرہ بی بی نے دی ہیں۔"

میں نے صدر دروازہ بند کر لیا۔

چٹائی پر بیٹھ کر میں نے گولے کو کھولا۔ یہ کسی ہلکے مگر بہت نرم کپڑے کا پارچہ تھا جس میں بندھی ہوئی کنجیاں ... پارچے میں سے ہلکی سی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کنجیاں کھول کر انہیں چٹائی کی پائینتی زمین پر ڈال دیا اور کنجیوں کو گننے لگا۔ ان میں سے کچھ کا رنگ حال ہی میں صاف کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی کنجی، جس کے پورے حلقے پر باریک باریک ہندسے کھدے ہوئے تھے، مجھے استاد کے چہرے سے

مشابہ نظر آئی لیکن مشابہت کا سبب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کنجیاں چٹائی کے نیچے رکھ دیں اور ایک بار پھر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اسی جگہ پر اپنے باپ کا مرنا یاد آیا اور میں نے اپنا بدن اکڑا کر پیر پھیلا دیے۔ میری ایڑی کو نرم کپڑے کا مس محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کیے کیے خم ہو کر سرخ پارچے کو اٹھا لیا اور اس کا گولا سا کر پھینکنے کو تھا کہ مجھے احساس ہوا اس میں سے پھل کی خوشبو غائب ہو گئی ہے۔ میں اسے اپنے نتھنوں کے قریب لایا اور مجھے شبہ ہوا کہ اس میں کوئی اور خوشبو موجود ہے۔ میری آنکھیں میری خواہش کے بغیر کھل گئیں۔ میں نے پارچے کو پورا کھول کر دونوں ہتھیلیوں پر پھیلا لیا۔ یہ ایک بڑا رومال تھا جس کے بیچ میں بہت ہلکے سرخ رنگ کے ریشمی دھاگے سے ایک مچھلی کڑھی ہوئی تھی۔ اس کے سفنوں کا جال چھوٹے چھوٹے پھندوں سے بنایا گیا تھا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت میری توجہ مچھلی سے زیادہ اس مدھم خوشبو کی طرف تھی جو پورے رومال میں گشت کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے رومال کا پھر سے گولا بنا لیا اور پوری سانس کھینچ کر اسے سونگھا۔ خوشبو بہت آہستہ آہستہ ابھری اور پھر ڈوب گئی، جیسے خوشبو سونے میں سانس لے رہی ہو۔ مجھے خوشبوؤں سے دلچسپی اور عطریات کی کچھ پہچان بھی تھی مگر اس مرکب خوشبو کا کوئی بھی جز میری شناخت میں نہ آ سکا۔ میں نے اسے دیر تک اور بڑے دھیان سے سونگھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری سانس کے ساتھ رومال میں سے نکل کر میرے سینے میں اتر گئی ہے۔ میں اسے پہچان تو نہ سکا لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ اگر یہ ذرا بھی تیز ہوتی تو اسی وقت میرا دم گھٹ جاتا۔

جب نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو مجھے دھندلا سا خیال آیا کہ میں اپنے باپ کے مرنے کی جگہ پر لیٹا ہوا ہوں اور ابھی ابھی میں نے اپنے استاد کے مرنے کی خبر سنی ہے۔ لیکن اس خیال کا کوئی اثر ظاہر ہونے سے پہلے ہی میں سو گیا۔

میں نے اپنے استاد کو دیکھا۔ لیکن خواب میں وہ مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آیا اور اس پر، جیسا کہ خوابوں میں اکثر ہوتا ہے، مجھ کو ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔

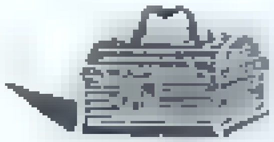

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

مراسلہ

[illegible]

[illegible]

مکرمی! آپ کے موقر اخبار کی وساطت سے میں متعلقہ حکام کو شہر کے مغربی علاقے کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج جب بڑے پیمانے پر شہر کی توسیع ہو رہی ہے اور ہر علاقے کے شہریوں کو جدید ترین سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں، یہ مغربی علاقہ بجلی اور پانی کی لائنوں تک سے محروم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی کوئی ہی سمتیں ہیں۔ حال ہی میں جب ایک مدت کے بعد میں اس طرف ایک ضرورت سے چلا ہوا تو مجھ کو شہر کا یہ علاقہ بالکل ویسا ہی نظر آیا جیسا میرے بچپن میں تھا۔

مجھے اس طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اپنی والدہ کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ برسوں پہلے وہ بڑھاپے کے سبب چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں، پھر ان کی آنکھوں کی روشنی بھی قریب قریب جاتی رہی اور ذہن بھی ماؤف سا ہو گیا۔ معذوری کا زمانہ شروع ہونے کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ مجھ کو ہر رات میں تین چار مرتبہ اپنے پاس بلا کر کپکپاتے ہاتھوں سے سر سے پیر تک ٹٹولتی تھیں۔ دراصل میرے پیدا ہونے کے بعد ہی سے ان کو میری صحت خراب معلوم ہونے لگی تھی۔ کبھی انھیں میرا بدن بہت ٹھنڈا محسوس ہوتا، کبھی بہت گرم، کبھی میری [illegible] معلوم ہوتیں اور کبھی میری آنکھوں کی رنگت میں تغیر نظر آتا۔ حکیموں کے ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کو بہت سی بیماریوں کے نام اور علاج زبانی یاد تھے اور کچھ کچھ دن بعد وہ مجھے کسی نئے مرض میں مبتلا قرار دے کر اس کے علاج پر اصرار کرتی تھیں۔ ان کی معذوری کے ابتدائی زمانے میں دو تین بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں

کسی کام میں لگ کر ان کے کمرے میں جانا بھول گیا تو وہ معلوم نہیں کس طرح خود کو کھینچتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آ گئی تھیں۔ کچھ اور زمانہ گزرنے کے بعد جب ان کی ذہنی حالت بھی جواب دے گئی تو ایک دن ان کے معالج نے محض یہ آزمانے کی خاطر کہ ان کے ہاتھ پیروں میں اب بھی کچھ سکت باقی ہے، مجھے دن بھر ان کے پاس نہیں جانے دیا اور وہ بہ ظاہر مجھ سے بےخبر رہیں۔ لیکن رات گئے ان کے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز سن کر جب میں لپکا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ دروازے تک کا آدھا راستہ طے کر چکی تھیں۔ ان کا بستر جو انھوں نے میرے والد کے مرنے کے بعد سے زمین پر بچھانا شروع کر دیا تھا، ان کے ساتھ گھسٹا ہوا چلا آیا تھا۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر ہی ان کو کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لیے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے سبب بےہوش ہو گئیں اور کئی دن تک بےہوش رہیں۔ ان کے معالج نے بار بار اپنی غلطی کا اعتراف اور اس آزمائش پر پچھتاوے کا اظہار کیا، اس لیے کہ اس کے بعد ہی سے میری والدہ کی بینائی اور ذہن نے جواب دینا شروع کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کا وجود اور عدم برابر ہو گیا۔

ان کے معالج کو مرے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا، لیکن حال ہی میں ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے پائنتی زمین پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ایک ہاتھ سے میرے بستر کو ٹٹول رہی ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ؟" میں نے ان کے ہاتھ پر خشک رگوں کے جال کو دیکھتے ہوئے پوچھا، "یہاں آ گئیں؟"

"تمھیں دیکھنے۔ کیسی طبیعت ہے؟" انھوں نے اٹک اٹک کر کہا۔ پھر ان پر غفلت طاری ہو گئی۔

میں بستر سے اتر کر زمین پر ان کے برابر بیٹھ گیا اور دیر تک ان کو دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی اس صورت کا تصور کیا جو میری اولین یادوں میں محفوظ تھی اور چند لمحوں کے لیے ان کے بوڑھے چہرے کی جگہ انھیں یادوں والا چہرا میرے سامنے آ گیا۔ اتنی دیر میں ان کی غفلت کچھ دور ہوئی۔ میں نے آہستگی سے انھیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"اٹھیے، آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں۔"

"نہیں،" انھوں نے بڑی مشکل سے کہا، "پہلے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"طبیعت کیسی ہے؟"

کچھ دن سے میری طبیعت واقعی خراب تھی، اس لیے میں نے کہا، "ٹھیک نہیں ہوں۔"

میری توقع کے خلاف انھوں نے بیماری کی تفصیل دریافت کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا،

"کسی کو دکھایا؟"

"کس کو دکھاؤں؟"

مجھے معلوم تھا وہ کیا جواب دیں گی۔ یہ جواب وہ فوراً اور ہمیشہ ایک لہجے میں دیتی تھیں، لیکن اس بار انھوں نے دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی افسردگی اور قدرے مایوسی کے ساتھ وہ بات کہی:

"تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میں ان کے ساتھ بچپن میں وہاں جایا کرتا تھا۔ یہ پرانے حکیموں کا گھرانا تھا۔ یہ لوگ میری والدہ کے قریبی عزیز تھے۔ ان کا مکان بہت بڑا تھا جس کے مختلف درجوں میں کئی خاندان رہتے تھے۔ ان سب خاندانوں کے سربراہ ایک حکیم صاحب تھے جنھیں شہر میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں تھی لیکن آس پاس کے دیہاتوں سے ان کے یہاں اتنے مریض آتے تھے جتنے شہر کے نامی ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ آتے ہوں گے۔

اس مکان میں تقریبیں بہت ہوتی تھیں جن میں میری والدہ کو خاص طور پر بلایا جاتا تھا اور اکثر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی تھیں۔ میں ان تقریبوں کی عجیب عجیب رسموں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہاں میری والدہ کی بڑی قدر ہوتی ہے اور ان کے پہنچتے ہی سارے مکان میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ خود بھی وہاں کے کسی فرد کو فراموش نہ کرتیں۔ چھوٹوں اور برابر والوں کو اپنے پاس بلاتیں، بڑوں کے پاس آپ جاتیں اور وہاں کے خاندانی جھگڑوں میں، جو اکثر ہوا کرتے، ان کا فیصلہ سب کو منظور ہوتا تھا۔

وہاں بہت سے لوگ تھے، لیکن مجھ کو صرف حکیم صاحب کا چہرہ دھندلا دھندلا سا یاد تھا۔ وہ بھی شاید اس وجہ سے کہ ان میں اور میری والدہ میں ہلکی سی خاندانی مشابہت تھی۔ اب مجھے اتنا یاد ہے کہ وہاں ہر عمر کی عورتیں، مرد اور بچے موجود رہتے تھے اور ان کے ہجوم میں گھری ہوئی میری والدہ مجھے ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے بہت سی پتیوں کے بیچ میں ایک پھول کھلا ہوا ہو۔

لیکن اس وقت وہ ایک مرجھایا ہوا چہرہ میری طرف گھمائے ہوئے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تمھاری آواز بدلی ہوئی ہے،" انھوں نے کہا۔ "تم وہاں کبھی نہیں چلے جاتے؟"

"وہاں—اب میں وہاں کسی کو پہچان بھی نہ پاؤں گا۔"

"دیکھو گے تو پہچان لو گے۔ نہیں تو وہ لوگ خود پہچانیں گے۔"

"اتنے دن ہو گئے،" میں نے کہا۔ "اب مجھے راستہ بھی یاد نہیں۔"

"باہر نکلو گے تو یاد آتا جائے گا۔"

"کس طرح؟" میں نے کہا۔ "سب کچھ تو بدل گیا ہو گا۔"

"کچھ بھی نہیں،" انھوں نے کہا۔ پھر ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ لیکن ایک بار پھر انھوں نے کہا، "کچھ بھی نہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل غافل ہو گئیں۔

میں دیر تک ان کو سہارا دیے بیٹھا رہا۔ میں نے اس مکان کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ان دنوں کا تصور کیا جب میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔ میں نے اس مکان کا نقشہ بھی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے صدر دروازے کے سامنے ایک ٹیلا تھا جو حکیموں کا چبوترہ کہلاتا تھا۔ اتنا اور مجھے یاد تھا کہ حکیموں کا چبوترہ شہر کے مغرب کی جانب تھا۔ اس پر چند کچی قبریں تھیں اور اس تک پہنچتے پہنچتے شہر کے آثار ختم ہو جاتے تھے۔

میں نے اپنی والدہ کو اپنے ہاتھوں پر لٹا دیا، بالکل اسی طرح جیسے کبھی وہ مجھ کو لٹایا

[illegible]
لیکن میں نے ان سے کہا،

"امی، آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں، کل سویرے میں وہاں ضرور جاؤں گا۔"

دوسرے دن سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد میری آنکھ کھلی اور آنکھ کھلنے کے کچھ دیر بعد میں گھر سے روانہ ہو گیا۔

۲

خود اپنے محلے کے مغربی حصے کی طرف ایک مدت سے میرا گذر نہیں ہوا تھا۔ اب جو میں ادھر سے گذرا تو مجھے بڑی تبدیلیاں نظر آئیں۔ کچے مکان پکے ہو گئے تھے۔ خالی پڑے ہوئے احاطے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں بدل گئے تھے۔ ایک پرانے مقبرے کے کھنڈر کی جگہ عمارتی لکڑی کا گودام بن گیا تھا۔ جن چہروں سے میں پہلے آشنا تھا ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ اگرچہ مجھ کو جاننے والے کئی لوگ ملے جن میں سے کئی کو میں بھی پہچانتا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے ہی ہم محلہ ہیں۔ میں نے ان سے رسمی باتیں بھی کیں لیکن کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد میرا محلہ پیچھے رہ گیا۔ شہر کی مضافاتی آبادی آئی اور نکل گئی۔ پھر دور دور تک پختہ سڑکیں تھیں جن پر کھانے پینے کی عارضی دکانیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ لیکن میں جس سڑک پر سیدھا آگے بڑھ رہا تھا اس پر اب جابجا گڑھے نظر آ رہے تھے۔ کچھ اور آگے بڑھ کر سڑک بالکل کچی ہو گئی۔ راستہ یاد نہ ہونے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں صحیح سمت میں جا رہا ہوں۔ اس لیے میں آگے بڑھتا گیا۔

دھوپ میں تیزی آ گئی تھی اور اب کچی سڑک کے آثار بھی ختم ہو گئے تھے۔ بس گرد آلود پتوں والے درختوں کی دو رویہ مگر ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے درمیان اس کا تصور کیا جا سکتا تھا لیکن چونکہ یہ قطاریں اس طرح منتشر ہوئیں کہ سڑک ہاتھ کے پھیلے ہوئے پنجے کی طرح پانچ طرف اشارہ کر کے رہ گئی، یہاں پہنچ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے محلے سے بہت دور نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے وہاں پر ٹھہر کر واپسی کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد آلود پتوں والے درخت اونچی نیچی زمین پر ہر طرف تھے۔ میں نے ان کی قطاروں کے درمیان سڑک کا تصور کیا تھا لیکن وہ قطاریں بھی شاید میرے تصور کی پیداوار تھیں اس لیے کہ اب ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اپنے حساب میں میں بالکل سیدھی سڑک پر چلا آ رہا تھا لیکن مجھے بارہا اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ دیکھنے میں سیدھی معلوم ہونے والی سڑکیں بھی غیرمحسوس طریقے پر ادھر ادھر گھوم جاتی ہیں کہ ان پر چلنے والے کو خبر بھی نہیں ہوتی اور اس کا رخ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے میں کئی مرتبہ ادھر ادھر گھوم چکا

ہوں اور اگر مجھ کو سڑک کا سراغ مل جاتا تو میں خود سے اپنے گھر تک بھی پہنچ سکتا۔ لیکن اس وقت مجھ کو واپسی کے راستے سے زیادہ حکیموں کے چبوترے کی فکر تھی جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف پتھر ہوئے اور اسی چھدرے تھے کہ زمین کا کوئی بڑا حصہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ لیکن میرے بائیں ہاتھ زمین دور تک اونچی ہوتی گئی تھی اور اس پر جگہ جگہ گھنی جھاڑیاں بھی تھیں … اسی وجہ سے بلندی کی دوسری طرف والا نشیبی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر تک میں اِدھر اُدھر ہوتا رہا … میرا خیال صحیح تھا۔ جھاڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ میں سے نکلتے ہی مجھے سامنے کتھئی رنگ کی پتلی پتلی اینٹوں والا ایک مکان نظر آیا۔ یہ وہ مکان نہیں تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تاہم میں سیدھا اس طرف بڑھ گیا۔ اس کے دروازے پر کسی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی جس کے قریب قریب سب حروف مٹ چکے تھے۔ مکان کے اندر خاموشی تھی لیکن ویسی نہیں جیسی ویران مکانوں سے باہر نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے دروازے پر تین بار دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازے کی دوسری طرف ہلکی سی آہٹ ہوئی اور کسی نے آہستہ سے پوچھا

"کون صاحب ہیں؟"

بتانے سے کیا فائدہ؟ میں نے سوچا، اور کہا،

"میں شاید راستہ بھول گیا ہوں۔ حکیموں کا چبوترہ اِدھر ہی کہیں ہے؟"

"حکیموں کا چبوترہ؟ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

یہ میرا … سوال سن کر مجھے ہلکی سی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی لیکن … دروازے کی دوسری طرف کوئی عورت تھی جس کی آواز نرم اور لہجہ بہت مہذب تھا … دروازے کی … پٹ کو پکڑ رکھا تھا … سے ہٹتے ہوئے … دروازے کا پٹ کھلا؟ اور کھلا … اندر مجھ کو دروازے کے پیچھے … ایک ڈیوڑھی اور ڈیوڑھی کے پیچھے صحن کا ایک گوشہ … نظر آ گئیں جن پر دھوپ پڑ رہی تھی … مجھے کچھ یاد آیا کہ میری والدہ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے اس مکان میں بھی اترتی تھیں۔ لیکن اس مکان کے رہنے والے مجھے یاد نہ آ سکے۔

"آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟" دروازے کی دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔

"جی ہاں،" میں نے کہا اور اپنا اتاپتا بتا دیا۔ پھر کہا "بہت دنوں کے بعد اِدھر آیا ہوں۔"

دیر کے بعد مجھے جواب ملا،

"اس مکان کے پیچھے چلے جائیے۔ چبوترہ سامنے ہی دکھائی دے گا۔"

مکان کے اندرونی حصے سے کسی بوڑھی عورت کی بھاری آواز سنائی دی،

"کون آیا ہے میرا؟"

… جگہ کا … کر کے مکان کی پشت پر آ گیا۔ سامنے دور تک چھوٹی بڑی کئی قبریں نظر … تھیں اور ان کی بےترتیب قطاریں پھر ایک سڑک کا تصور پیدا کر رہی تھیں۔ یہ …

صحن مٹی کے تودے تھے لیکن ان سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیلے پر جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس ٹیلے کو غور سے دیکھا۔ جھاڑیوں کے بیچ بیچ میں کچی قبروں کے نشان نمایاں تھے۔ بعض بعض قبروں پر چونے کی سفیدی دھوپ میں چمک رہی تھی۔

۲

مکان چبوترے کی اوٹ میں تھا اور اس تک پہنچنے کے لیے مجھے چبوترے کا آدھا چکر کاٹنا پڑا۔ پرانی لکڑی کے بھاری صدر دروازے کے سامنے کھڑا دیر تک میں سوچتا رہا کہ اپنے آنے کی اطلاع کس طرح کراؤں۔ دروازے کی لکڑی بہت دبیز اور تھوڑی سیلی ہوئی تھی۔ اس پر دستک دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، پھر بھی میں نے تین بار اس پر ہاتھ مارا لیکن اپنی دستک کی آواز خود مجھ کو ٹھیک سے سنائی نہیں دی۔ مجھے شبہ ہوا کہ مکان اندر سے بند ہے۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو اس کے دونوں پٹ بڑی سہولت کے ساتھ اپنی چولوں پر گھوم گئے اور مجھ کو اپنے سامنے ایک کشادہ ڈیوڑھی نظر آئی جس کے ایک سرے پر دبیز ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب گیا اور اب مجھے مکان کے اندر لوگوں کے بولنے چالنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے دستک دی اور اندر کسی نے کسی کو پکار کر کہا،

"دیکھو کوئی آیا ہے۔"

تب میرا دماغ سوالوں سے منتشر ہونا شروع ہوا۔ اس مکان میں کون کون ہے؟ میں کس سے کیا بات کروں؟ کہ اپنے آنے کی غرض کیا بتاؤں؟ کہ اپنے کو کس طرح پہچنواؤں؟ … میں نے چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں، لیکن اسی وقت پردے کے پیچھے سے کسی عورت نے روکھے لہجے میں پوچھا،

"کون ہے؟"

میں نے اپنا پورا نام بتا دیا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

اس کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"حکیم صاحب سے،" میں نے کہا۔

"مطب دوسری طرف ہے، وہیں جائیے۔ وہ تیار ہو رہے ہیں۔"

آخری لفظوں تک پہنچتے پہنچتے آواز دور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے اور ذرا بلند آواز میں کہا،

"اندر اطلاع کرا دیجیے۔"

آواز پھر قریب آ گئی اور اب اس کے لہجے کا روکھاپن کچھ کم ہوا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے یہاں بھی اپنا اتا پتا بتایا۔ کچھ توقف کے بعد … کا نام لیا، پھر … ان کے گھر کا نام بتایا، یہ بتایا کہ میں ان کا بیٹا ہوں، پھر جھجکتے جھجکتے اپنا … لاڈ کا نام بھی بتا دیا جس سے میں بچپن میں پکارا جاتا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ بہت بےترتیب انداز میں بتایا جسے پردے کے ادھر والی عورت نے کسی کے پوچھنے پر تھوڑے مربوط کر کے دہرایا اور مکان کے اندر

عورتوں کے بولنے کی آوازیں تھوڑی دیر کے لیے تیز ہو گئیں۔ مجھے ان آوازوں میں اپنی والدہ کا گھر کا نام اور اپنا بچپن والا نام بار بار سنائی دیا۔ یہ دونوں نام میں نے برسوں کے بعد سنے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر یہ نام اسی طرح سنائی دیتے رہے تو مجھ کو اس مکان کا پورا نقشہ اور اس کے رہنے والے سب یاد آ جائیں گے بلکہ میرے ذہن میں ایک کشادہ صحن کا نقش بننا شروع بھی ہو گیا تھا۔ لیکن عین اس وقت ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ٹاٹ کا پردہ میری طرف بڑھا، اوپر اٹھا، اور اس کے پیچھے سے ایک بائیسکل کا اگلا پہیا نمودار ہوا۔ میں ایک کنارے ہو گیا اور بائیسکل لیے ہوئے ایک لڑکا اندر سے ڈیوڑھی میں آیا اور مجھے سلام کرتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد پردے کے پیچھے سے پھر کچھ آوازیں اٹھیں اور چار پانچ بلّیاں پردے کے نیچے سے نکل کر ڈیوڑھی میں آئیں۔ ان کی بے ترتیب رفتار دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں باہر کی طرف ہنکایا گیا ہے۔ بلّیاں آپس میں کچھ کھکھیاں سی کرتی لڑکھڑاتی ہوئی صدر دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے بعد مکان کے اندر سے دیر تک کوئی آواز نہیں آئی۔ میں ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے اکتا گیا۔ مجھے وہم ہونے لگا کہ پردے کے پیچھے سے ویران مکانوں والی خاموشی باہر نکل کر مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے لیکن اسی وقت دوسری طرف سے کسی نے کہا:

"آئیے، اندر چلے آئیے۔"

میں ٹاٹ کا پردہ ایک طرف کر کے اس مکان کے صحن میں اتر گیا۔

۲

بڑے صحن، گہرے گہرے دالانوں، شہ نشینوں، صحنچیوں اور لکڑی کی محرابوں والے مکان میں نے اپنے بچپن میں بہت دیکھے تھے۔ یہ مکان ان سے مختلف نہیں تھا۔ لیکن مجھے یاد نہ آ سکا کہ کبھی میں یہاں آیا کرتا تھا۔ کشادہ صحن کے بیچ میں کچھ دیر کے لیے رک کر میں نے دیکھا کہ مکان کا ہر درجہ آباد ہے۔ کئی صحنچیوں سے عورتیں گردن باہر نکالے متجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر کی بیگم کو کس حصے میں ہونا چاہیے، اور سیدھا اس دالان کی طرف بڑھتا چلا گیا جس کی بلند محرابوں میں عنّابی رنگ کے بڑے بڑے قمقمے لٹک رہے تھے۔ دالان میں بیچ تختوں کا چوکا اور اس کے دونوں طرف بھاری مسہریاں تھیں۔ سب پر صاف ستھری دھلی ہوئی چادریں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے بعض کا ابھی کلف بھی نہ ٹوٹا تھا۔ چوکے پر ایک معمّر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں پہچانے بغیر سلام کیا۔ انھوں نے آہستہ سے مسکرا کر بہت سی دعائیں دیں۔ پھر بولیں:

"بیٹا آج ادھر کہاں بھول پڑے؟"

مجھے خیال ہوا یہ سوال اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے، لہٰذا اپنے امکان بھر شائستگی کے ساتھ میں نے ان کی مزاج پرسی کی، اور وہ بولیں:

"تمھیں تو اب کیا یاد ہو گا، چھٹ پن میں تم یہاں آتے تھے تو جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔"

پھر انھوں نے ایسی کئی تقریبوں کا ذکر کیا جن کے بعد میری والدہ کو محض میری ضد کی

وجہ سے کئی کئی دن رکنا پڑا تھا۔

"تب بھی تم روتے ہوئے جاتے تھے،" انھوں نے کہا اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

اس دوران مکان کے مختلف درجوں سے نکل نکل کر عورتیں اس بڑے دالان میں جمع ہوتی رہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنا تعارف خود کرایا۔ پیچیدہ رشتے میری سمجھ میں نہ آئے لیکن میں نے یہ ظاہر کیا کہ ہر تعارف کرانے والی کو میں پہچان گیا ہوں اور ہر رشتہ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ سب عورتوں نے بالوں میں بہت سا تیل لگا کر چوٹیاں گوندھ رکھی تھیں، سب موٹے سوتی دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں جن میں سے بعض بعض گھر کے رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک کے پاس میرے بچپن کے قصوں کا ذخیرہ تھا۔ مجھے صحن کے کنارے لگا ہوا امرود کا ایک درخت دکھایا گیا جس پر سے گر کر میں بے ہوش ہو گیا تھا اور مجھے بے ہوش دیکھ کر میری والدہ بھی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ میری شرارتوں کا ذکر چھڑا تو معلوم ہوا کہ میں نے وہاں پر موجود ہر عورت کو کسی نہ کسی شرارت کا نشانہ بنایا تھا۔

مجھے احساس ہوا کہ میں دیر سے ایک لفظ بھی نہیں بولا ہوں۔ سب لوگ شاید اب میرے بولنے کے منتظر تھے اور دالان میں کچھ خاموشی سی ہو گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو چوکے پر ایک طرف تین چار لڑکیاں سمٹی دکھائی دیں۔ میں نے ان سے ان کی تعلیم اور دوسرے مشغلوں کے بارے میں دریافت کیا تو وہ شرما کر ایک دوسرے کے قریب گھسنے لگیں اور ان کی طرف سے دوسروں نے جواب دیے۔ ان سے کچھ فاصلے پر تین لڑکے کسی وقت آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ان سے اپنے خیال میں ان کی دلچسپی کی دو چار باتیں کیں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھیں کن باتوں میں دلچسپی ہے۔ لڑکے مجھے بیوقوف اور لڑکیاں بدصورت معلوم ہوئیں لیکن لڑکیوں کا شرمانا اچھا لگا۔ میں ان سے کچھ اور باتیں کرنے کے لیے ان کی دلچسپی کا کوئی موضوع سوچ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ سائیکل والا لڑکا واپس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اخباری کاغذ کی کئی پڑیاں تھیں جن میں بعض پر چکنائی پھوٹ آئی تھی۔ اس نے دالان کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد قریب کے کسی درجے سے ان کے ہنسنے اور چینی کے برتن بجنے کی آوازیں آئیں۔ مجھے دونوں آوازوں میں مبہم سی مشابہت محسوس ہوئی، اور یہ بھی شبہ ہوا کہ لڑکیاں میرے بولنے کی نقل اتار رہی ہیں۔

میں نے اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ مجھے اس دالان میں بیٹھے ہوئے کتنی دیر ہو گئی لیکن اسی وقت میرے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ کھلا اور اس کی چلمن کے پیچھے حکیم صاحب کھڑے نظر آئے۔ میں نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ وہ سر پر ٹوپی کا زاویہ درست کر رہے تھے۔ پھر وہ چلمن کی طرف منہ کر کے اپنی جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگے۔ ان کے پیچھے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا جس کے قریب دیہاتی مردوں اور عورتوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔

"ارے بھئی، ہم آ رہے ہیں،" حکیم صاحب نے کہا اور چلمن اٹھائی۔

"آئیے آئیے،" گھر کی بیگم بولیں، "دیکھیے کون آیا ہے، پہچانا؟"

حکیم صاحب دالان میں آ گئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر انھیں سلام کیا۔ وہ حسبِ معمول ہنسے

Scanned with CamScanner

ہے۔ میرا نام لے کر بولے:
"میاں آپ تو بہت بدل گئے۔ کہیں اور دیکھتا تو بالکل نہ پہچانتا۔"
کچھ دیر تک وہ بھی مجھ سے میرے بچپن کی باتیں بتاتے اور میرے والد کی وضع داری کے قصے سناتے رہے۔ اتنے میں ایک ملازمہ پیتل کی ایک لمبی کشتی میں کھانے کی چیزیں لے کر آ گئی۔ میں نے ایک نظر کشتی میں لگی ہوئی چینی کی نازک طشتریوں کو دیکھا۔ ان میں زیادہ تر بازار کا سامان تھا لیکن کچھ چیزیں گھر کی بنی ہوئی بھی تھیں۔ حکیم صاحب نے کشتی کی طرف اشارہ کیا اور بولے:
"میاں تکلف سے کام مت لیجیے گا۔" پھر بیگم سے بولے، "اچھا بھئی ہم کو دیر ہو رہی ہے۔"
اس کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔
"ان کو مطب سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔" بیگم نے معذرت کے انداز میں کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں لیکن مجھ پر شاید کچھ دیر کو غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ جب میں چونکا تو دالان میں صرف بیگم تھیں اور اس کی دو محرابوں پر کسی موٹے کپڑے کے پردے جھول رہے تھے۔ صرف بیچ کی محراب کھلی ہوئی تھی اور اس میں لٹکا ہوا شیشے کا [illegible] ہوا کبھی داہنی طرف چکر کھاتا تھا کبھی بائیں طرف۔ میں نے چلمن کی جانب دیکھا۔ دوسرے دروازے کے قریب حکیم صاحب ایک بوڑھے دیہاتی کی نبض پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں بیگم کی طرف مڑا۔ ان پر بھی غنودگی طاری تھی، لیکن قریب کی کسی صحنچی سے لڑکیوں کی گھٹی گھٹی ہنسی کی آواز آئی تو وہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گئیں۔

"کب میر آئی ہیں؟" انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مجھے ان کے اترے چہرے پر پہلی بار فکر کی ہلکی سی پرچھائیں نظر آئی۔ اسی وقت داہنی طرف والی محراب کا پردہ ہٹا اور ایک نوجوان لڑکی دالان میں داخل ہوئی۔ میں نے اس کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ وہ کسی بے شکن کپڑے کی نارنجی ساری باندھے تھی اور اس کے ناخن نارنجی پالش سے رنگے ہوئے تھے۔ بیگم مجھ سے مخاطب ہوئیں:
"میر کو پہچانا؟"
میں نے پھر ایک اچٹتی ہوئی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر نارنجی لپ سٹک کی بہت ہلکی تہہ تھی۔ میں نے سر کو یوں جنبش دی گویا اسے بھی دوسری عورتوں کی طرح پہچان گیا ہوں۔ پھر میں نے اس کو غور سے دیکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ پردے کے پیچھے سے کسی لڑکی نے اسے دھیرے سے آواز دی اور وہ دالان سے باہر چلی گئی۔
حکیم صاحب اسی طرح بوڑھے دیہاتی کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور بیگم پر پھر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بیگم نے ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے کہا:
"اب اجازت دیجیے۔"
"جا رہے ہو؟" انہوں نے بوجھل آواز میں پوچھا۔ اور اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔
"وہ ڈراونی کوٹھری اب بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈراونی کوٹھری؟" انہوں نے کہا، کچھ سوچا، پھر افسردگی کے ساتھ مسکرا کر بولیں، "ایک بار تم نے میر کو اس میں بند کر دیا تھا۔" پھر ان کی مسکراہٹ میں زیادہ افسردگی آ گئی۔ "پھر کبھی یہاں کی کوئی شے تو یاد آئی؟"
"اب بھی ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔
"وہ گیا ڈیوڑھی کے برابر دروازہ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہاں پہلے باورچی خانہ تھا، دھوئیں سے دیواریں کالی ہیں۔ ایک دروازہ باہر کی طرف بھی ہے کھلا ہو [illegible] کنڈی بہت اونچی ہے۔"
"میں ادھر ہی سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا، رخصتی سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور صحن کی طرف مڑا۔
"اسی طرح کبھی کبھی یاد کر لیا کرو [illegible]" اور ان کی آواز تھوڑی کپکپا گئی۔ "وقت نے بڑا فرق ڈال دیا ہے بیٹے۔"
ان کے ہونٹ ابھی ہل رہے تھے لیکن میں صحن پار کر کے ڈیوڑھی سے متصل دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کوئی [illegible] اندھیرا بہت گہرا نہیں تھا۔ ایک طرف ٹوٹا پھوٹا مٹی کا بڑا سا چولہا تھا جیسے توڑ دیا گیا تھا۔ سامنے روشنی کی ایک کھڑی لکیر نظر آ رہی تھی۔

باہر کا دروازہ۔ میں نے اپنے آپ کو بتایا اور لکیر کے پاس پہنچ کر اس سے آنکھ لگا دی۔ سامنے [illegible] کا چبوترہ دکھائی دے رہا تھا [illegible] میں نے [illegible] اپنی طرف کھینچا [illegible] ایک پٹ کھلا۔ میں نے کنڈی چھوڑ دی [illegible] مجھے حیرت [illegible] طرح کے دروازوں کو کھولنا [illegible] میں پھر [illegible] کیا تھا۔ میں نے دونوں پٹ ایک ساتھ اپنی طرف کھینچ کر کھولے اور باہر نکل آیا۔
کچھ دیر بعد میں [illegible] چبوترے [illegible] کی جھاڑیاں اور کچی قبریں [illegible] اور زیادہ صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے وہاں کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی [illegible] میں نے چبوترے کو [illegible] اور اسی وقت مجھے کچھ اور یاد آ گیا۔ میں واپس مڑا اور چبوترے کے [illegible] آ گیا۔
قبروں کی تعداد میرے اندازے سے زیادہ تھی۔ لیکن پتاور کا وہ جھنڈ غائب تھا جو ایک بہت پرانی [illegible] سمجھا جاتا تھا۔ جو لوگ اسے دیکھنے کا دعویٰ کرتے تھے [illegible] اس کے بعض پر بال اگ آتے ہیں۔ [illegible] پتاور کے جھنڈ کے پاس گھنٹوں رہتے [illegible] اندر [illegible] چھپا تھا لیکن [illegible] سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ شاید اسی وجہ سے یہ بہت مشہور تھی [illegible] حکیم خاندان کا نگہبان ہے۔ خشک اور سبز پتاور کے اس جھنڈ کا نقشہ میرے ذہن میں بالکل واضح ہو گیا تھا لیکن یہ مجھے یاد نہ آ سکا کہ وہ چبوترے پر کس طرف تھا۔ جس جگہ اس کے ہونے کا مجھے گمان تھا وہاں پر کئی قبریں تھیں جن پر چونے کی سفیدی چمک رہی تھی۔
چبوترے پر سے مکان کے عقبی دروازے کو میں دیر تک دیکھتا رہا۔ میرا [illegible]

Scanned with CamScanner

پر دستک دی۔ اور میں چند قدم ادھر بڑھا بھی، لیکن پھر رک گیا
یہ بہت واہیات بات ہو گی میں نے سوچا، اور چبوترے پر سے مکان کی مخالف سمت اتر
ن

واپسی کا راستہ مشکل نہیں تھا۔ میں بہت آسانی سے گھر پہنچ گیا۔

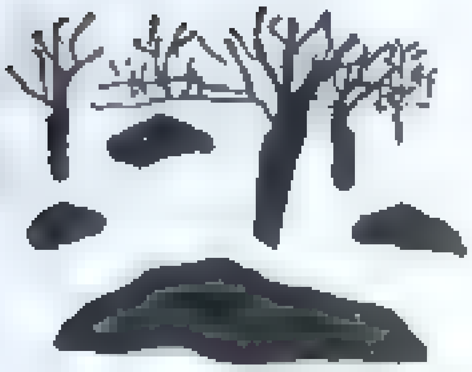

نیر مسعود

ساسانِ پنجم

دور دور تک پھیلے میدانوں میں بکھری ہوئی ان کوہ پیکر سنگی عمارتوں کے سینے میں صدیاں تک گئی تھیں اور ان کو کھنڈر ہوئے بھی صدیاں گذر گئی تھیں۔ جہاں پر سب سیاح ان کھنڈروں کے بچرے دروں، اونچے ستونوں اور بڑے بڑے طاقوں کو حیرت سے دیکھتے اور ان زمانوں کا تصور کرتے تھے جب گذشتہ بادشاہوں کے یہ آثار صحیح سلامت اور وہ بادشاہ بھی زندہ رہے ہوں گے۔ ان عمارتوں میں لگے ہوئے پتھر کی سطحوں پر کندہ تصویروں کو زیادہ غور اور دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ تصویریں اپنے زمانے کی تاریخ بیان کر رہی ہیں۔ ان میں تاج پوشیوں، جنگوں، ملاقاتوں، فاتح بادشاہوں کے دربار میں شکست خوردہ بادشاہوں کی حاضری اور خوبصورت موقعوں کے منظر دکھائے گئے تھے جن سے ان پرانے زمانوں کی بہت سی باتوں کا کچھ اندازہ ہوتا تھا اور ان علاقوں کی پرانی تاریخ اور تمدن کے بارے میں کچھ غیریقینی سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

انہی کھنڈروں کے پتھروں پر بہت سے کتبے بھی کھدے ہوئے تھے اور سیاح ان کو بھی دلچسپی سے اور دیر دیر تک دیکھتے تھے لیکن ان تحریروں کو کوئی پڑھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھنے میں صرف ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے قطاروں کی صورت میں مختلف زاویوں سے تیروں کے پیکان بنا دیے ہیں۔ لیکن اس میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا کہ پتھر کی سطح پر پیکانوں کی یہ قطاریں دراصل لمبی لمبی عبارتیں ہیں جنھیں اگر پڑھ لیا جائے اور سمجھ بھی لیا جائے تو ان کی مدد سے ان تصویروں کو بھی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں بھی معلوم ہو سکتی ہیں جن کا تصویروں سے معلوم ہونا ممکن نہیں۔

ہمارے عالم ایک مدت سے ان تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ناکام ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اسی زمانے کی تحریریں ہیں جس کی کچھ تصویریں ساسانِ پنجم نے فراہم کی تھیں۔ لیکن ان تصویروں کی مدد سے ان کتبوں کو پڑھنا ممکن نہ ہو سکا ہے کہ وہ عربی پیکانی عبارت

Scanned with CamScanner

میں نہیں تھی، وہ ساسانِ پنجم کو گذرے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس زمانے میں تھا۔

آخر ایک مدت کی کاوشوں کے بعد جب مردہ زبانوں کو پڑھنے کا فن کافی ترقی کر گیا تو [illegible] سے ہمارے عالم پہیلیوں کی [illegible] کی مدد سے ان تصویروں کو بھی پوری طرح سمجھ لیا گیا۔ اس طرح گویا تحریروں یا تصویروں کا احسان اتار دیا۔

ایک ایک کر کے سارے کتبے پڑھ لیے گئے اور اس شہر کا نام خود ہی ختم مقدم کیا گیا کہ ہماری رسموں میں ایک نئی زبان کا اضافہ ہوا ہے جو ہزاروں سال پرانی ہے۔

[illegible] پنجم کی ہر ہر لیے ہوئے لفظوں کی زبان سے کوئی تعلق نہیں نکلا بلکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی اتفاقی مشابہت بھی نہیں پائی گئی اور یہ بات ہمارے عالموں کے [illegible] ان لفظوں کی زبان کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے بارے میں عالمانہ خیال ظاہر کیے تھے۔ اب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ساسانِ پنجم زمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا فریب یا سب سے بڑا مذاق تھا، جس کا شکار ہونا ظاہر ہے انھیں پسند نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے اب وہ چاہتے ہیں کہ ساسانِ پنجم اور اس کی زبان [illegible]

[illegible] پڑتی ہے کہ ساسانِ پنجم کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ ایک تو اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا [illegible] انکار کی دلیل یہ دی گئی کہ چار ابتدائی ساسانوں کے بعد پانچویں ساسان کا وجود قائم نہیں ہو سکتا، اور تاریخ میں ایک ساسان کے سوا ساسان دوم، ساسان سوم اور ساسان [illegible] ساسانِ پنجم بھی نہیں تھا اس کے ساتھ اس کی پیش کی ہوئی زبان کو بھی باطل کر دیا گیا۔

لائق عالموں نے بڑی محنت سے ثابت کیا ہے کہ ساسانِ پنجم نے جس زبان کے اصلی اور قدیمی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس زبان کا کبھی وجود نہ تھا، اور ساسانِ پنجم نے اس موہوم زبان کے جو [illegible] درج کر کے ان کے جو معنی لکھے ہیں وہ سب لفظ خود اسی کے گھڑے ہوئے ہیں اور اس سے [illegible] ہوئے ہیں یہ کسی قسم سے انھیں لکھا تھا [illegible] اس زبان کی جو قواعد ساسانِ پنجم نے ظاہر کی ہے وہ بھی [illegible] کی اختراع ہے، [illegible] کسی بھی زبان کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب اس طرح نہیں تھی جس طرح ساسانِ پنجم کی اس مفروضہ قواعد میں ملتی ہے۔

[illegible] نے یہ تمام باتیں ثابت کرنے میں عجیب عجیب مطالعے اور ذہنی کاوش کے ثبوت دیے، عرصے علم اور منطق دونوں سے کام لیا ہے اور اس مسئلے کی ہر نئی دریافت ان کے دعووں کو مزید مستحکم [illegible] ہے۔ تاہم انھیں [illegible] اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ایک عرصے تک ساسانِ پنجم کو حقیقی اور اس کی زبان کو اصلی سمجھا جاتا رہا اور گذشتہ عالم اس زبان کے لفظوں کا بکثرت استعمال کرتے تھے، لیکن ان لفظوں کی مدد سے ایک مستقل اور قائم

خاندان [illegible] زبان بولتے اور لکھتے میں ان گذشتہ عالموں کو کامیابی نہیں ہو سکی اگرچہ ان میں سے کئی اس زبان سے واقفیت کے مدعی بنتے جاتے ہیں۔

آج کا عالم بتاتا ہے کہ گذشتہ زمانے میں کچھ لفظ استعمال ہوتے تھے جن کا حقیقی وجود نہیں تھا [illegible] اس طرح کہ یہ [illegible] میں [illegible] کے جسے یہ دراصل ان کے معنی [illegible] تھے دراصل ان کے معنی کچھ بھی نہیں تھے تاہم [illegible] ہر لفظ ایک مخصوص معنی کے لیے استعمال ہوتا تھا یعنی بولنے والا ایک لفظ بولتا تھا [illegible] اس سے ایک معنی مراد لیتا تھا اور سننے والا اس کے وہی معنی سمجھتا تھا جو بولنے والا مراد لیتا تھا، لیکن حقیقت میں لفظ کے [illegible] معنی نہیں ہوتے تھے جو بولنے والا مراد لے اور سننے والا سمجھے [illegible] کہ دراصل وہ کوئی لفظ نہیں ہوتا تھا [illegible] اور چونکہ وہ کوئی لفظ نہیں ہوتا تھا اس لیے اس کے کوئی معنی بھی نہیں ہوتے تھے [illegible] جو یہ معنی لفظ جس زبان کے سمجھے جاتے تھے اس زبان کا بھی حقیقی وجود نہیں تھا۔ اگرچہ عالم اس امکان کا انکار نہیں کرتے کہ کسی زمانے میں کہیں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہو، تاہم دراصل یہ کوئی زبان تھی نہیں۔

[illegible] کی ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ کوئی ساسانِ پنجم تھا، نہ اس کی پیش کی ہوئی کوئی زبان تھی، نہ اس زبان کا کوئی لفظ تھا اور نہ اس لفظ کے کچھ معنی تھے۔

لیکن اس ساری تحقیق کا خلاصہ یہ بھی ہے کہ ایک وقت میں کچھ معنی تھے جو بعض [illegible] سے ادا ہوتے تھے، اور یہ لفظ ایک زبان سے منسوب تھے [illegible] اس زبان کا تعارف ایک شخص نے کرایا تھا، اور وہ شخص خود کو ساسانِ پنجم بتاتا تھا۔

نیر مسعود

جانِ عالم

وِل اس خالقِ حقیقی کی ثنا چاہیے جس نے ایک حرفِ کُن سے صفحۂ درعالم پر کیا کیا صورتیں دکھائیں بعدہ گلہ اس خالقِ مجازی کا کیا چاہیے جس نے فسانہ عجائب لکھ کر ہم گنہ گار جانِ عالم کی ہر زہ در ہزار کتنی بنائیں۔ وہ کون؟ مرزا رجب علی بیگ سرور مصور کہ بیت السلطنت لکھنؤ کے یک مردِ تلاش ہیں، جو بیگمی بادشاہی کارخانے سے اصلا واقف نہیں تھے یہ بھی اپنی خیرہ بختی، نصیبہ کی مشکل تھی کہ اپنی خلقت اس مردِ تلاش بیں کے ہاتھوں ہوئی تھی، اس حیلے سے ہم چشموں میں آبرو کھوتی تھی۔

فسانہ عجائب، کہ فی الواقع خزانہ عجائب ہے، مرزا نے دوستوں میں پھیر تو دیا لیکن جس شاہزادے کو بزور طلاقتِ لسانی و فصاحتِ بیانی کتمِ عدم سے معرضِ وجود میں لائے، اس کے اپنے راز کو سمجھ نہ پائے۔ ناچار بہ حالتِ اضطرار ان مصور سے عرض کرتا ہے کہ اگر خود بدولت شہزادہ دل افگار ہوتے تو کیا کرتے اور واقعہ عشق میں کیونکر پالا پڑتا۔ پس مجھ سے پہلے یہ مقدمہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ جانِ عالم میں روح پرفتوح مرزا سرور کی غالب ہے۔ شاہزادے کا جو سچ پوچھو تو قالب ہی قالب ہے۔

پہلا ستم مرزا نے توتے کی خریداری میں ڈھایا۔ یہ فقرہ سنایا کہ جانِ عالم پر بہ شکلِ ... گزری بازار میں اس حیوانِ ناطق کا پنجرہ ہاتھ میں لے مالک سے اس کی قیمت پوچھی۔

در انصاف کو کام فرمائیے کہ شاہزادہ جانِ عالم، باپ جس کا شاہ فیروز بخت "مالکِ تاج و تخت" گردوں وقار پرتمکین با اقتدار" جس کو "سکندر سے ہزار خادم دارا سے لاکھ فرماں بردار" وہ گزری بازار میں چڑیا ماروں سے مول تول کرتا پھرتا

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

میں تو شرم سے کٹ کٹ گیا بلکہ حیرت سے جی مٹ گیا۔ اس درجہ یہ امر شاق ہوا مگر وہ جو مثل ہے مردہ بدست زندہ، اسی کا مصداق ہوا۔

پھر مرزا نے یہ تماشا دکھایا کہ توتے کی زبان سے انجمن آرا شہزادی کا ... سنایا اور مجھ کو اس کا نادیدہ عاشق بنایا۔ حالانکہ میں سادہ لوح یہ سمجھا تھا کہ ایک توتے کی باتوں میں ذکر انجمن آرا کا جس کا آوازہ شہر و دیار ہوتا ... مگر مرزا کو تو قصہ آگے بڑھانا تھا اس واسطے یہ کھیل بھی دکھانا تھا۔ اس طائرِ سبز قبا کو بھی سخنداں ... تھا اور اس وقت تو وہ ... الحسن آرا کی محبت میں ... تھا۔ یہ بھید میری سمجھ میں بھی آ رہا تھا مگر اصل یہ ہے کہ معاملہ اپنے ... واحد تھا یعنی وہ قفس کی تنگی سے نکل کر لطفِ سیاحت کا مزا چاہتا تھا میں بھی کہ شادی کے جنجالوں میں گرفتار تھا کچھ دن کے لیے ... زندگی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ یہ تو میں کسی شاہزادی کی خاطر دربدر ہوا تھا نہ توتے ... میرا رہبر ہو ... کی یہ کہ آغازِ سفر ہی میں وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔ اچھا بھلا مرنا تھا عنقا ہو گیا۔

معلوم ہوا ہے کہ داستانوں میں کسی ایک فرد کو ہیرو کہا جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ فسانۂ عجائب کا ہیرو مجھ گناہ گار کو مقرر کیا ہے۔ اپنے تئیں ہیرو جان کر جو صدمے جان حزیں پر گزر گئے ان کا جو ذکر ہی کیا ہے، بڑا رنج اس کا ہے کہ اربابِ نقد نے ہیرو قرار دے کر مجھ کو انتقاد کی کسوٹی پر کسنا اور کبھی مجھ پر گرجنا، کبھی سرور مصور پر برسنا شروع کر دیا ہے۔ بعضے بعضے بزرگوں نے یہ لکھا کہ جانِ عالم کا مثالی کردار ہے، بعضوں نے کہا یہ کردار عیب دار ہے۔ کس واسطے کہ اربابِ نقد کی نظر کدورت اثر میں اگر کوئی کردار ... عیب ہے تو یہ سمجھیں اس کا عیب لاریب ہے۔ دو ایک بزرگوار میرے عیوب ... کو ... کبھی نکتہ کہ جانِ عالم کا کردار کہاں مثالی ہے وہ تو جوہرِ عقل ہی سے خالی ہے۔ ... ثبوت ... لاتے ہیں کہ اس نے بے سمجھے بوجھے اپ کو ... میں گرایا اور ... نقشِ سلیمانی ہاتھ سے گنوایا اور وہ تو وزیر زادۂ نابکار کی باتوں میں آیا ... کی بدعقلی کی دھوم رہتی ہے۔ بعض ... اس کو ساری مصیبتوں کا ذمہ دار، مہر نگار "عمی اللہ شہ زادہ" کہتی ہے بلکہ وہ تو خود بھی اپنے آپ کو "عشق میں گرفتار" بتاتا اور ساری داستان میں اول تا آخر غلطی پر غلطی کرتا جاتا ہے۔ مگر ان کلماتِ لاطائل سے جو اندیشہ ... کو ہوئیں وہ اس صدمے کے مقابل ہیچ تھیں کہ اسی ... کو مجھ حقیر بے تقصیر کی خوبی بتایا گیا ہے اور اربابِ نقد کے نزدیک اسی خوبی کی وجہ سے جانِ عالم کو جیتا جاگتا پایا گیا ہے۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

بر این عقل و دانش بباید گریست

جواب ان امور کا تفصیل طلب ہے یہاں اتنی فرصت کب ہے۔ مختصر کہتا ہوں کہ میں ایک محبوب پری رو کی ... سے ... میں ... پڑا، لڑکپن ... مستحسن ... جہنم کی ... گوارا کرتے ہیں۔ میں نے نقشِ سلیمانی کو ہاتھ سے دیا ... پری رو کی ... سے کہیں کم۔ وزیر زادے پر اگر میں نے اعتبار کیا، تبدیلِ قالب کا راز ... دیا تو کیا آپ اپنے کسی جگری دوست پر اعتبار اس کو اپنا راز دار نہیں کریں گے؟ اگر انجمن آرا اور مہر نگار مجھ کو کم عقل جانتی ہیں تو کون سی انوکھی بات ہے، خاوند کو بے عقل سمجھنا تو ... صنفِ ...

Scanned with CamScanner

مستورات ہیں۔ اور ہاں جو میں نے اپنے تئیں عشق میں گرفتار کیا، وہ ازراہ انکسار کہا۔ اعتراف نادانی نہ کرتا تو کیا ضمہ عقل کا دم بھرتا؟

خیال فرمائیے گا کہ جب میں وضع داستان کی ترتیب میں آ کر روح اپنی بندر کے قالب میں لے گیا اور وہ سگ … میرے قالب پر متصرف ہوا۔ مردہ جان عالم ہی سمجھا اور میرے ذریعے ہر کر تمام بندروں کو پکڑوایا اور بلاتفریق سب کے سر پھروانے لگا تو میں خوف جان سے درختوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ بارہا یہ تدبیر خیال میں آئی کہ بندر کا قالب چھوڑ روح اپنی کسی اور جانور کے قالب میں لے جاؤں اور وزیر زادہ بدنہاد کے … سے جان بچاؤں۔ مگر میرے جسد … سرور کو … وہ بھلا کہاں جانے دیتے۔ انہیں تو میری جان ملکہ مہر نگار کے ہاتھوں بچانی تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کی فراست مکانی تھی۔ بس جب اس نے مجھے توتا دکھا کر اس کی گردن مروڑی تب میں نے بندر کے جسم کی جان چھوڑ کر توتے کے قالب میں سمایا۔ … ملکہ کا بار احسان اٹھایا۔

اب اصل قصہ مجھ سے سنیے اور ناسازیِ بخت ناساز و کج بازیِ فلکِ حقہ باز پر سر دھنیے … ہوا یوں کہ جو سرور داستان سنانے چلے تھے میری اور انھیں … جب دیکھا کہ یہ داستان جلد ختم ہو جائے گی اور گروہ سامعین میں شرف قبول نہ پائے گی بیچ میں ملکہ مہر نگار کو کھینچ لائے۔ وہ عورت بلا کی دماغ دار … آپ تو کہاں جاتے، میری اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ پری زادوں کے جھرمٹ میں "ہودار پر ایک آفتاب محشر سوار۔ تاج مرصع سر پر، لباس شاہانہ پُرتکلف بر میں … سیماب وش ہاتھ ہاتھ میں بندوق چقماقی … برابر رکھے شکار کھیلتی، سیر کرتی چلی آتی ہے۔" اس پر نظر پڑتے ہی منہ سے تو نکلا:

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

مگر جی میں سوچا مرزا نے غضب کر دیا۔ کس بری جھنڈے کو مہمان کیا۔ میری رسوائی جگ ہنسائی کا سامان کیا۔ کیا جان عالم بے چارہ اور کیا … یہ تو … پر غالب آ جائے گی۔ دیکھتے دیکھتے پورے قصے پر چھا جائے گی پھر کسی سے کچھ بن نہیں آئے گی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اور خود مرزا بھی اس کو داستان میں لا کر ایسے مدہوش ہوئے کہ دوسرے افراد قصہ یکبارگی فراموش ہوئے۔ واللہ اعلم … روسیاہ میں اس ملکہ کی … کیا بات پائی کہ صورت دیکھتے ہی متاع صبر و ہوش لٹائی، روبرو … ہوئی عاشق … ہوئی۔ عشق اور عقل میں بیر مشہور ہے مگر … دیکھا کہ سراپا عشق اور مجسم … نہیں نہ اس کے مقابلے پر آ سکتا تھا نہ اس زبردست سے بچ پا سکتا تھا۔ وہ ملکہ … جہاں دیدہ … سے زیادہ … جب دیکھا کہ وہ ہر مہم کو سر کر سکتی ہے اور مجھ سے بہتر کر سکتی ہے۔ اور مرزا سرور بھی اس کی جانب نگراں، مجھ سے روگرداں ہیں، سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا۔ یہ شعر شاعر کا اپنی … حال کیا۔

ما اختیار خویش بہ دست تو دادہ ایم
دنیا و دین بہ نرگس مست تو دادہ ایم

آخر میں مرزا سرور کی ایک اور ستم ظریفی کا تذکرہ ضروری ہے وہ کب کہ فسانہ عجائب کے ختم پر یہ جملہ مسطور ہے "جس طرح جان عالم کے مطلب ملے اسی طرح کل عالم کی مراد … سبحان اللہ … ایک … سے کھبرا کے جان … وطن سے … داستان … ہو کر … اور ارباب نقد میں سے ایک شخص پوچھتا کہ کیونکر ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

آفتاب کی طرح

دیکھو تو سہی کہ کس طرح
میری آنکھ سے مرا غم فرود
ڈھل رہا ہے قطرہ قطرہ آب کی طرح
دیکھو تو مرا یہ سرکش و سیہ سایہ کس طرح
اسیرِ دستِ آفتاب ہے
(شعاعِ آفتاب کی طرح)
دیکھو کس طرح مرا وجود
مٹ رہا ہے
(سطحِ آب پر حباب کی طرح)
اک شرارہ مجھ کو اپنی سمت کھینچتا ہے
مجھ کو اوجِ آسماں پہ لے چلا ہے
دام ہیں کہ میرے جسم سے لپٹ رہا ہے
دیکھو تو یہ میرے آسمان پر
چمک رہا ہے کیا شہاب کی طرح

تو ندیم من
میرے پاس آگیا ہے کتنی دور سے
خوشبوؤں کی سرزمیں سے، اور شفق رنگ و نور سے
تو مجھے بٹھا رہا ہے اک سفینۂ حسیں پہ

Scanned with CamScanner

[illegible]

کس طرح سجا ہوا ہے بادلوں سے، تاج سے، بلور سے
تو مرے لیے امید دل نواز ہے
اے امید دل نواز ہوا
مجھ کو بھی ساتھ لے چل کبھی ساتھ
شہر شہر، شہر نور میں

میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے تو
مجھ کو ساتھ لے چلا ہے کہکشاں کی راہ پر
تو مجھے بسا رہا ہے کہکشاں سے بھی بلند تر بہشت گاہ پر
دیکھ تو
ہر رتہ ستارہ سی دمک رہی ہوں میں
سادہ لوح سرخ مچھلیوں کی طرح
دیکھ تو
ستارہ ماتھے پہ سجی شب کو تک رہی ہوں میں

کتنی دور ہے سرف رسی!
آسمان کی کھڑکیوں دریچوں میں
پھر سے گونجنے لگیں تری صدائیں،
د ھب
فرشتوں کے سجدہ برف سے پروں کی سرسراہٹیں
دیکھ تو کہاں پہنچ گئی ہوں میں
(کون سی جگہ ہے یہ)
کہکشاں کہ یہ کراں، کہ جاوداں؟

اب کہ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں ہم
مجھ کو موج بادہ میں ڈبو بھی دے
مجھ کو بھی بوسہ ہائے گرم کے سرور میں لپیٹ لے
مجھ کو اب شب فراق کے ستم میں مبتلا نہ کر
مجھ کو اپنے دام سے رہا نہ کر
مجھ کو ان ستاروں سے جدا نہ کر، جدا نہ کر

دیکھ تو سہی کہ موم بن کی رات
کس طرح مرے لبِ پگھل رہی ہے
قطرہ قطرہ آب کی طرح
میرے لمس کی حرارتوں سے
میری آنکھ کے سبو میں کس طرح چھلک رہے ہیں
ان گنت حسین خواب
جن میں نشہ ہے شرابِ ناب کی طرح

دیکھ تو سہی یہ کیا ہوا کہ میرے شعر
گاہوارہ بن گئے ہیں جن میں تو چمک رہا ہے
آفتاب کی طرح

اندھیری راتوں میں

اندھیری راتوں میں
مجھے صدائیں دیں
اندھیری رات تھی اور چار سمت سناٹا
ہوا کے جھونکوں سے
لرز رہا تھا، بہت بے قرار تھا پردہ
فلک تھا افسردہ
فلک پہ دور کہیں اک ستارہ جلتا تھا
ستارہ جلتا تھا
ستارہ ڈھلتا تھا
مجھے صدائیں دیں
مجھے صدائیں دیں
میں اپنی ہستی کو
سنبھالے بیٹھی تھی ہاتھوں پہ جام کی صورت
مرے دریچوں سے
دکھائی دیتی تھی ماہ تمام کی صورت
کہ ایک نغمہ زار
دھوئیں کی طرح اٹھا، روزنوں کی سمت چلا

Scanned with CamScanner

تمام رات میرے
دہکتے سینے میں
کوئی سسکتا رہا فرطِ ناامیدی سے
کوئی بلاتا رہا بار بار لہو کے جیسے
مگر اندھیرے میں تو سخت سرد ہاتھوں نے
دھکیل دیا اس کو
اندھیری راتوں میں
سیہ درخت کی شاخوں سے غم برستا رہا
کوئی زخود رفتہ
کسی پکار کے پیچھے لیے ترستا رہا
ہوا کا ہر جھونکا
سیہ درخت کی زلفوں میں خاک بھرتا رہا

مگر یہ مرتا رہا
مراد بے سروسامان سے پیار کرتا رہا

ہدیہ

میں انتہائے شب کی بات کر رہی ہوں
انتہائے ظلمت، انتہائے شب کی بات کر رہی ہوں میں
جو آؤ میرے گھر اگر تو میرے مہرباں
تمہارے ساتھ اک چراغ بھی ضرور ہو
اور اک دریچہ بھی ہو جس سے جھانک
میں کم سے کم گلی میں دیکھ تو سکوں
کہ میرے گھر کے پاس ہی
بہت سے ایسے لوگ ہیں جو شاد و بامراد ہیں

فارسی سے ترجمہ: [illegible]

Scanned with CamScanner

بابا مقدم

پنجرے

پنجروں کا عجائب خانہ اس شہر کی قابلِ دید جگہوں میں سے تھا۔ وسیع میدان میں ایک پہاڑی پر بنی ہوئی اس کی مخروطی چھت والی عمارت دور ہی سے نظر آنے لگتی تھی۔

موٹریں تماشائیوں کو ایک لہراتی ہوئی سڑک سے، جس کے دونوں طرف شہتوت کے درخت لگے ہوئے تھے، عمارت کے سامنے والے میدان میں اتارتی تھیں۔ اگر کوئی پہاڑی پر پیدل جانا چاہتا ہو تو اس کے لیے ایک تنگ راستہ تھا جس پر سو سے زیادہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ پیدل جانے والا دو تین بار بیچ بیچ میں بنے ہوئے چبوتروں پر بیٹھ کر سستانے کے بعد ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔

اوپر سے نیچے تک پوری پہاڑی ڈھالوں میں ترتیب کے ساتھ لگائی ہوئی انگور کی بیلوں اور سماق کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس بنجر میدان میں جہاں خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ اگتا تھا، اس طرح ہری بھری پہاڑی کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص کا جی چاہتا تھا کہ ان سیڑھیوں سے اوپر چڑھے اور اس سبز پہاڑی پر سے میدان اور اطراف کے نشیب و فراز کا منظر دیکھے۔

باہر سے عجائب خانے کی شکل ایک چوڑے ستون کی سی تھی جس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس کی دیوار بتدریج زمین سے اٹھ کر گنبد تک پہنچتی ہوئی لوہے کی لمبی لمبی سلاخوں سے بنی گئی تھی۔ گنبد کے سرے پر ایک حلقہ تھا اور اس میں لگا ہوا ایک بڑا سا آنکڑا اوپر فضا میں اٹھتا چلا گیا تھا۔

عمارت کا فرش دور دور تک سے ہوئے پانی پر قائم کیا گیا تھا اور اس طرح دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا پنجرہ آسمان سے لٹکا ہوا ہے۔

اگر کوئی پنجروں کے عجائب خانے کی سیر کرنا چاہے تو اس کو عمارت کے سامنے کے میدان سے شروع ہونے والی کچھ اور سیڑھیاں چڑھ کر اس بڑے پنجرے کے دروازے تک جانا ہوگا

وہاں پنجرے ہی کی شکل کا ایک عجائب گھر ہے۔ عجائب خانے کے شعبہ محافظ سے معلوماتی کتابچہ لے کر وہ عمارت کے اندر داخل ہو گا۔

عمارت کے اندر تین منزلیں ہیں اور اس کے مرکز میں بنا ہوا ایک پیچ دار زینہ ان تینوں منزلوں کو آپس میں ملاتا ہے۔

اور یہ عمارت پنجروں سے بھری پڑی ہے۔ چھوٹے اور بڑے پنجرے [illegible] کے پنجرے [illegible] سونے اور چاندی کے پنجرے اور یہ پنجرے طرح طرح کی شکلوں کے ہیں۔ ان میں سے بعض جو دور دراز سرزمینوں کے نیم وحشی قبیلوں اور پسماندہ معاشروں کے [illegible] ہیں [illegible] جیسی طرح دیکھنے کے لیے دیر تک ایک ہی جگہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ ہر پنجرے کے پاس ہی یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اسے کہاں بنایا گیا، کب خریدا گیا اور اس میں کس قسم کا جانور یا پرندہ رکھا جاتا تھا۔ ان پنجروں میں کوئی جانور نہیں ہے [illegible] رکھے ہوئے ہیں۔ سارے پنجروں میں جانوروں کی بیٹھنے اور سونے کی اڈے، پٹریاں، کٹورے اور اشیاء بھی موجود ہیں۔

عجائب خانے کے اندر کی فضا بھی ایسی ہے کہ ہر طور کرنے پر تماشائی خود کو اچانک ایک بڑے سے پنجرے میں بند محسوس کرتا ہے اور اس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلا پنجرہ جس کا نمبر ایک ہے، چھوٹا سا اور لکڑی کا بنا ہوا ہے، اور اس میں پانی کی کٹوری اور دانے کا برتن رکھا ہوا ہے۔ معلوماتی کتابچہ دیکھنے پر تماشائی کو اس کی صراحت ملتی ہے:

میں نے پہلی قفس کو ایک لڑکے کے پاس دیکھا جس نے اس میں ایک گوریا کا بچہ بند کر رکھا تھا۔ یہ ننھا پرندہ پنجرے کے اندر سکڑا ہوا اونگھ رہا تھا۔

میں نے یہ پنجرہ پرندے سمیت لڑکے سے خرید لیا۔ پرندے کا پورا [illegible] اور [illegible] مندمل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے رہا کر دیا۔ وہ جھجھکتا ہوا پنجرے سے باہر نکلا اور اپنے کمزور [illegible] ایک دیوار پر بیٹھ گیا [illegible] پر جا بیٹھا۔ میں خالی پنجرہ [illegible] پنجرے میں رکھ کر سے دیکھتا [illegible]

میں دیکھتا [illegible] کہ بہت سے لوگ طرح طرح کی چیزیں جمع کرتے ہیں [illegible] جمع کرتے ہیں [illegible] ادھر ادھر سے تلاش کر کے اکٹھا کرتے ہیں۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ میں پنجرے جمع کروں گا۔ یہ خیال مجھے بہت پسند آیا۔ مجھے اپنے باپ سے ترکے میں بڑی جائیداد ملی تھی۔ میرے بیوی بچے بھی نہیں تھے۔ میرے جیسے تنہا آدمی کے لیے یہ بڑا اچھا مشغلہ تھا۔ لہٰذا میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بازاروں اور محلوں میں گھومنا شروع کیا اور پنجرہ بھی خریدا۔ اس پنجرے میں ایک طوطا [illegible] پرندہ پنجرے کے فرش پر [illegible] ادھر سے ادھر چکر کاٹ

کرتا ہے اور ہمیشہ باہر کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

جس دن میں نے اسے دیکھا وہ چہچہا رہا تھا اور سیٹیاں بجا رہا تھا۔ وہ اپنے ہم جنسوں کو بلا رہا تھا۔ بیوپاری کا خوش الحان [illegible] کھلی فضا کا طلب گار تھا جس میں پر کھول کر اڑ سکے۔ اس کی یہ کوشش اور فریاد کا انداز دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ جیسے بھی بن سکا میں نے اس کے مالک کو جو ایک دکان دار تھا راضی کر کے اسے خرید لیا اور گھر لے آیا۔ یہ پرندہ دن بھر میرے گھر میں سیٹیاں بجاتا اور زور زور سے چہچہاتا رہتا۔ پنجرے کی اندر یک آہنگ تک ہو جاتا۔ پرندہ کبھی کبھی اس کے سامنے [illegible] اور یہ سمجھ کر کہ سامنے [illegible] طرفہ ہے اپنے معصوم کو بہلا کر چہچہانے لگتا۔ اسی دن [illegible] میں اس کا پنجرہ اٹھا کر شہر کے باہر لے گیا۔ سرکاریوں کے ایک کھیت میں جا کر میں نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور پرندے کو آزاد کر دیا۔ ایک شخص جو وہیں پر موجود تھا، کہتا رہا کہ اس پرندے کو شکرا جھپٹ کر لے جائے گا مگر میں اس کی بات پر کان دھرے بغیر دیکھ رہا تھا کہ پرندہ اڑا اور اڑتے اڑتے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

گھر لوٹ کر میں بہت خوش تھا کہ اب میرے پاس ایک اور پنجرہ ہو گیا۔ میں نے اسے جھاڑ پونچھ کر ایک کھونٹی سے لٹکا دیا۔ یہ مضبوط پنجرہ تھا جس کی کڑیاں تانبے کی تھیں۔ [illegible] کپڑے کا، پانی کی کٹوری چینی کی، دانے کی پیالی پر مہین کاری اور ایک چھوٹا سا آئینہ۔

پھر دو تین دن ایسے گذرے کہ میرے دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا میں اس کو دور نہ کر سکا۔ میں نے خود سے کہا:

"اے مرد، ہر شخص کسی نہ کسی راستے پر لگا ہوا ہے۔ یہ تیرا راستہ ہے: پرندوں کو ان کے پنجروں سمیت خریدنا، پرندوں کو آزاد کرنا اور پنجروں کو جمع کرنا۔"

کبھی کبھی میں یہ سوچ کر خوش ہوتا تھا کہ ایک دن میں پنجروں کے سب سے بڑے ذخیرے کا مالک ہو جاؤں گا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے جب دنیا میں کوئی پنجرہ باقی نہ رہ جائے، یا کم از کم وہ سرزمین جہاں میں رہتا ہوں پنجروں سے خالی ہو جائے۔

اسی فکر اور اسی آرزو میں اس میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو لڑکوں کو ملازم رکھ کر اپنے ساتھ لیا۔ بہت سے لوگ اپنے پنجرے بیچنے پر تیار نہ ہوتے۔ کہتے کہ یہ تو ہمارا مشغلہ ہے اور ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ میں جواب میں نرمی کے ساتھ ان سے بحث کرتا اور بہرطور آخرکار مجھے کو کامیابی ہوتی۔ ان سب کو پیسہ ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔

اس دن میں نے گیارہ پنجرے خریدے۔ ان پنجروں میں چار مینائیں، دو گوریاں، ایک طرفہ، ایک طوطا، دو قمریاں اور ایک بلبل تھی۔ دونوں ملازم لڑکوں کی مدد سے میں ان پنجروں کو شہر کے باہر ایک باغ میں لے گیا اور ان سب لوگوں کے سامنے جو ہمارے ساتھ ہو لیے تھے، میں نے پرندوں کو چھوڑ دیا۔ کسی لڑکے نے کہا کہ قمریاں بھوکی مر جائیں گی، گوریوں کو شکرا کھا جائے گا، طوطا اس علاقے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن میں ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر پرندوں کو آزاد کر کے خالی پنجرے گھر لے آیا۔

میرے اپنے شہر میں بہت سے لوگ کرک پالتے ہیں۔ یہ پرندہ درخت پر نہیں بیٹھتا بلکہ میدانوں اور کھیتوں میں رہتا ہے۔ اس کی رنگت خاکی اور جسامت کبوتر سے کم ہوتی ہے۔ جنگلی جھاڑیوں اور گیہوں کے کھیتوں میں انڈے دیتا اور بچے پالتا ہے۔ اس کا شکار کرنے والے جس کھیت میں اس کی آواز سنتے ہیں اس کے قریب ہی جال بچھا دیتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کی مدد سے ایسی آواز پیدا کرتے ہیں جو اس کی مادہ کی آواز سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ بیچارہ پرندہ آواز کی طرف بڑھتا ہے اور ناگہاں جال میں پھنس جاتا ہے۔ تب اس کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر لیتے ہیں۔ یہ اسیر پرندہ دن رات پنجرے کے در و دیوار پر ٹکریں مارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے سر اور پروں سے خون بہنے لگتا ہے۔ لوگ اس کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے پنجرے کی تیلیوں پر سوت کی جالی منڈھ دیتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں سویرے تڑکے جب [illegible] اور اکثر ہوتی ہے۔ میں نے کرک کا سا آزادی کا حریص کوئی پرندہ نہیں دیکھا۔ یہ کبھی پنجرے سے مانوس نہیں ہوتا۔ ہمیشہ باہر کی سمت دیکھتا رہتا ہے اور ہمیشہ پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکراتا رہتا ہے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ سب کرکوں کو آزاد کر کے رہوں گا۔ اپنی املاک سے میری جائداد بہت تھی اور اس کی بدولت اپنے فیصلے پر عمل کرنا میرے لیے بہت آسان ہو گیا۔ اتنا کہ کچھ عرصے کے اندر اس شہر میں ایک بھی ایسا پنجرہ نظر نہیں آتا تھا جس میں کوئی پرندہ قید ہو۔ اب کسی کو پنجرے کے اندر سے بلبل کی آواز، قناری اور شاما کی چہچہاہٹ، طوطے کی بولی سنائی [illegible] اور طوطے شہر کے باغوں میں وہیں درختوں پر سے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے ہیں۔

جب میں اپنے گھر میں خالی پنجروں کو دیکھنا شروع کرتا تو مجھ پر ایک کیف و نشاط کا [illegible] زندہ ہوں اور جب تک میری عمر ختم نہیں ہوتی میرا کام ابھی باقی ہے۔ مجھے دور افتادہ قریوں اور شہروں، زخار سمندروں کے دور دست جزیروں، تپتی ہوئی زمینوں، سر بہ فلک برف [illegible] ہر قریہ موجود ہونا چاہیے۔ میرا ذخیرہ تو محض مقامی تھا اور اس کی میری نظر میں کوئی [illegible] نہیں تھی۔

تو میں نے سفر کا سامان کیا اور دوسرے ملکوں کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ جس طرح شہر بہ شہر لوگوں کی زبان، لہجے، شکل صورت، رسم و رواج میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے اسی [illegible] جس چیز میں فرق نہیں آتا وہ انسان کا یہ شوق ہے کہ پنجرے بنائے اور جانوروں کو اسیر کرے۔ [illegible] پنجروں میں [illegible] رنگ کے پرندے، بھانت بھانت کے جانور نظر آتے تھے کہ یا تو ایک کونے میں سمٹے ہوئے پڑے ہیں یا چیخ رہے ہیں۔

ایک شہر میں مجھے لومڑی کا ایک بچہ [illegible] پنجرے میں بند نظر آیا۔ [illegible] اس کی آنکھوں سے [illegible] پاس بیٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے پنجرے سمیت خرید لیا۔ اس کا فروخت کر لینا اس کے مالک کے لیے ایسی امید کے خلاف بات تھی کہ وہ حیران تھا [illegible] خوش تھا۔ میں نے پنجرہ صحرا میں لے جا کر لومڑی کے بچے کو ٹیلوں کے درمیان چھوڑ دیا۔ اس کا پنجرہ بہت بھاری [illegible] کر جلا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سارے پنجروں کو [illegible] میں ہر جگہ کے صرف دو ایک خاص پنجرے چھانٹ کر رکھ لیتا اور بقیہ ضائع کر دیتا۔ میں ایک مشہور آدمی ہو چکا تھا۔ وہ آدمی جو پرندوں کو [illegible] کرتا ہے۔ پنجروں کو [illegible] ساتھ لے جاتا ہے۔ میری شہرت کا یہی [illegible] ذریعہ تھا کہ جہاں سے میں گذرتا تھا میرے پیچھے کوئی پنجرہ اور اس میں فریاد کرتا ہوا کوئی جانور، کوئی پرندہ باقی نہیں رہتا تھا۔

[illegible] عجائب خانے میں پنجرے دیکھ رہا تھا [illegible] میں [illegible] دور کے شہروں دیار سے لا کر جمع کیے تھے۔ [illegible] میں ہر جگہ پہنچ [illegible] زیادہ سے زیادہ پنجرے حاصل کرنے کی دھن میں ہر سرزمین کی سیر کی۔ اس عجائب گھر میں ایک پنجرے کے سامنے پہنچ گیا جو [illegible] خوش نما ہے۔ بیش بہا لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ ایک چابک دست صناع کی مہارت کا نمونہ ہے۔ اس کو سیپ کے ٹکڑوں، چاندی کی کیلوں [illegible] کے پھولوں سے منقش کیا گیا ہے۔ اس کے ستونوں اور شاخوں پر کندہ کاری کی گئی ہے [illegible] بیل بوٹوں [illegible] دلکش وضعوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ایک دن تھا جب اس پنجرے میں ایک [illegible] تھی۔ میں نے [illegible] بہت دور ایک جگہ دیکھا تھا۔ حسین [illegible] سیاہ رنگ، چونچ اور پنجے زرد اور سڈول۔ وہ لگاتار پنجرے میں ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔ اس کی [illegible] بار بار [illegible] اور اس کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ میں نے بڑی [illegible] منت سماجت کے بعد خرید لیا۔ اس کا مالک اتنے خوب صورت پرندے کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا تھا، مگر آخر راضی ہو گیا۔ میں نے اس کے سامنے ہی پنجرے کا در کھول دیا۔ مینا پھر پھڑا کر نکلی اور پاس کے ایک درخت پر جا بیٹھی۔ اس کے دوسرے دن وہیں مجھے ایک اور [illegible] نظر آئی [illegible] وہی وضع قطع کی۔ میں نے اسے بھی خریدا اور [illegible] کر دیا۔ تین دن میں تین دفعہ یہی واقعہ پیش آیا۔ چوتھے دن مجھے شک ہوا کہ شاید میں اسی ایک پرندے کو چوتھی دفعہ خرید رہا ہوں۔ اس لیے اب کی بار میں نے پنجرے اور مینا کو ساتھ لیا اور اس شہر سے روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک جنگل کے پاس رک کر میں نے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ مینا آہستہ سے پنجرے کے [illegible] سے نکلی۔ کچھ دیر تک دروازے پر رکی رہی۔ اس کی نظر درختوں پر جمی ہوئی تھی۔ شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں [illegible] کے بعد اچانک مینا نے پر کھول دیے اور جنگل میں غائب ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

غیر ملکوں اور اجنبی سرزمینوں کی سیاحت میں مجھے برسوں لگ گئے۔ بیس سال سے زیادہ کے عرصے تک میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں سرگرداں رہا۔ پنجرے دیکھے، ان میں محبوس جانور اور پرندے دیکھے، پنجرے خریدے، جانوروں کو چھوڑ دیا، پرندوں کو اڑا دیا۔ خالی پنجرے جتنے لا سکتا ساتھ لایا، باقی کو توڑ ڈالا، پانی میں ڈبو دیا، آگ میں جلا دیا۔

آخر برسوں کے بعد جب میرے بال سفید ہو چکے تھے، آنکھ، جوانی، زندگی کا ولولہ سب ختم ہو چکا تھا، ایک ہزار پنجروں کے ساتھ لدا پھندا میں اپنے شہر واپس پہنچا۔ میں بہت خوش تھا کہ دنیا میں پنجروں کا سب سے بڑا ذخیرہ میرے پاس ہے۔

لیکن واپس آنے کے پہلے ہی دن مجھے ہر دکان پر اور ہر مکان میں پنجرے نظر آئے۔ ان پنجروں میں رنگارنگ پرندے گردن ڈالے اڈوں پر بیٹھے تھے۔ پرندے پنجروں کی دیوار سے سر [illegible] رہے تھے۔ [illegible] کی التجائیں، طوطے کی چیخیں، [illegible] کی فریادیں پہلے سے زیادہ تیز تھیں۔ پنجرے [illegible] میں [illegible] حیوان لوگوں کی دولت و ثروت کا [illegible] تھے۔ بہت پیسے تھے کہ [illegible] کے ذریعے روزی کمانے [illegible]۔ پیسے تھے کہ خوب صورت پنجروں، نایاب پرندوں، [illegible] اور مضبوط [illegible]، [illegible] اور [illegible] بڑھتے ہوئے طوطوں کی مالک ہونے پر فخر کر رہے ہیں۔

پھر اب میں کیا کرتا؟ نئے سرے سے سب کو خریدنا اور آزاد کرنا شروع کرتا؟ نہیں، وقت گذر چکا تھا۔ میری زندگی کے کتنے ہی برس اسی دھن میں نکل گئے اور [illegible] کوشش [illegible] کے بعد میں دیکھ رہا تھا کہ پنجروں کی تعداد پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے اور پرندوں کی فریاد پہلے سے بھی زیادہ دل خراش ہے۔ سکھائے ہوئے [illegible] ایک [illegible] کی خاطر مجبور ہیں کہ چونچ سے [illegible] کھولیں اور [illegible] میں سے لڑکوں کی تقدیر کے پرچے باہر نکالیں۔ [illegible] دیکھ کہ [illegible] میں [illegible] پنجروں کی [illegible] پر [illegible] رہی ہیں۔ [illegible] کے پر جھڑ رہے ہیں اور بلبلیں پنجروں کے کونوں میں سر جھکائے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ طوطے آئینے کے سامنے کھڑے [illegible] کی آرزو میں چیخ رہے ہیں اور [illegible] ہر روز پنجرے کے در پر بھکاریوں کی طرح اپنے راتب کی منتظر ہیں۔

قاشاشا! تو جو اس شہر یا کسی اور شہر سے یہاں سیر کرنے آیا ہے، اس بڑے پنجرے میں ہر [illegible] پنجرے دیکھتا ہے اور اچانک سوچنے لگتا ہے کہ تو خود اس پنجرے کا قیدی ہے۔ تو ان خالی پنجروں کو دیکھتا ہے [illegible] ان حیوانوں کا تصور کرتا ہے جو ان میں رہ کر [illegible] اٹھ چکے ہیں، تو دروازے کی طرف جاتا ہے۔ تیرے دل میں ایک خوف ہے۔ اگر دروازہ بند ہوا، اگر کٹہرے کی سلاخیں [illegible] مضبوط ہوئیں تو تو یہیں پھنس کر رہ جائے گا۔ چیخے گا، مدد کے لیے پکارے گا مگر کوئی سننے والا نہیں، کوئی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ تو، تنہا اور مجبور، سلاخوں کے پیچھے سے، پنجرے کے اندر سے باہر کا عالم دیکھ رہا ہے۔ آسمان پر بادل دوڑ رہے ہیں، دریاؤں اور ندیوں میں پانی جاری ہے [illegible] پہاڑوں پر [illegible] گونج رہی ہے۔ چڑیاں آزادی کے ساتھ اڑ رہی ہیں، لوگ آ جا رہے ہیں اور تو نامعلوم مدت کے لیے اس پنجرے میں اسیر ہے۔ تیرے چہرے پر پسینہ آ جاتا ہے، تیرے پیروں کی طاقت سلب ہو جاتی ہے اور تیرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ سلاخوں کو گرفت میں لے کر آخری کوشش کرے

لیکن سلاخیں مضبوط ہیں اور تیرے بازو شل۔

قاشاشا! ہراساں نہ ہو۔ اس پنجرے کا دروازہ ہرگز بند نہ ہو گا۔ تو جب چاہے بڑی آسانی کے ساتھ [illegible] باہر جا سکتا ہے۔

[illegible] قاشاشا! تو بالآخر پہلی اور دوسری منزل سے گذر کر اس پنجرے کی تیسری منزل پر چلا [illegible]۔ یہاں بھی تجھے ہر جگہ پنجرے نظر آئیں گے۔ لیکن [illegible] پنجرہ [illegible] چھت کے [illegible] سے فانوس کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ یہ پنجرہ [illegible] کا شاہکار ہے اور [illegible] کاری گری [illegible] سال تک [illegible] اس پر محنت کی ہے۔ اس کے نقش و نگار دیکھ، اس کے بیل بوٹوں کے پیچ و خم دیکھ، کس کس [illegible] کے ساتھ [illegible] پیوست کیے گئے ہیں۔ سونے کے بنے ہوئے ان پرندوں کو دیکھ جو پنجرے کے باہر کی چھت اور سلاخوں پر بیٹھے ہیں۔

پھر پنجرے کے اندر دیکھ، تعجب نہ کر جیسے کہ تو دیکھ رہا ہے، ایک انسان کا پنجر ہے۔ میری [illegible] یہ تھی کہ خود کو کسی پنجرے میں قید کروں اور پھر خود ہی اپنا تماشائی بنوں [illegible] اور سچ مچ کا انسانی پنجر [illegible] جانتا یہ کس کا پنجر ہے۔

میں نے وصیت کر دی ہے کہ جب میں مر جاؤں تو میرے جسم کو جلا دیا جائے اور میری راکھ کسی برتن میں بھر کر اس پنجرے میں رکھ دی جائے۔ اگر میری وصیت پر عمل کیا گیا تو تو اسے دیکھے گا۔

اور قاشاشا! جب سیڑھیاں چڑھ کر [illegible] پہنچتا ہے تو اس کو بہت بڑا اور [illegible] نقش و نگار سے آراستہ پنجرہ [illegible] چھت سے لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پنجرہ کھڑکیوں سے [illegible] میں [illegible] رہتا ہے [illegible] اس میں بند ہے [illegible] کے ہاتھ پیروں اور کمر میں کمانیاں لگا کر سلاخوں میں اس طرح باندھا گیا ہے کہ وہ پنجرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہے۔ اور قاشاشا جب غور سے دیکھتا ہے تو اسے شیشے کا ایک سربند مرتبان بھی نظر آتا ہے جس میں کچھ راکھ اور جلی ہوئی ہڈیوں کے ٹکڑے بھرے ہیں۔

فارسی سے ترجمہ: [illegible]

آج کی کتابیں

آج ، پہلی کتاب	ترتیب ، اجمل کمال	قیمت ۱۲۰ روپے
چھپنی ہوئی تاریخ (نظمیں)	افضال احمد سید	قیمت ۲۰۰ روپے
بوف کور (ناول)	صادق ہدایت	قیمت ۱۵۰ روپے
بارہ ہندوستانی شاعر	ترتیب ، اجمل کمال	قیمت ۲۱۰ روپے
خیمۂ سیاہ (غزلیں)	افضال احمد سید	قیمت ۲۰۰ روپے
آوارگی (منتخب تراجم)	محمد عمر میمن	قیمت ۲۰۰ روپے

مکتبۂ دانیال سے طلب کریں

اردو نستعلیق کتابت کے لیے پہلا مکمل ورڈ پروسیسر

Wordprocessing program for Urdu Nastaleeq Kitabat

نستعلیق نظامی

ایپل میکنٹوش کمپیوٹر کے لیے

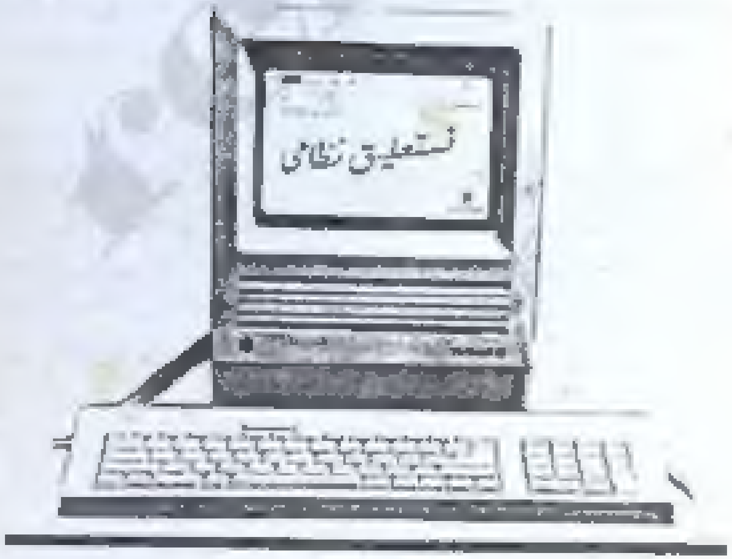

پاکستان ڈیٹا مینجمنٹ سروسز

۸۸، دارالامان کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۵، پاکستان

فون: ۴۱۸۸۰۷-۴۱۴۶۹۲

Pakistan Data Management Services

88, Darul-Aman Cooperative Housing Society, Karachi-5, Pakistan.

Phone: 418807 - 414692

Scanned with CamScanner

ایپل کمپیوٹر اب مقامی سطح پر

BUSINESS AUTOMATION (Pvt) LIMITED

آج

سرما ۱۹۸۹

نجیب محفوظ اور

نرمل ورما

کی کہانیوں کے ترجمے

فہمیدہ ریاض

احمد فواد اور

عذرا عباس

کی نظمیں

مظفر علی سید

کا مضمون

اکرام اللہ

کا مکمل ناولٹ

اور بہت سی متنوع تحریریں

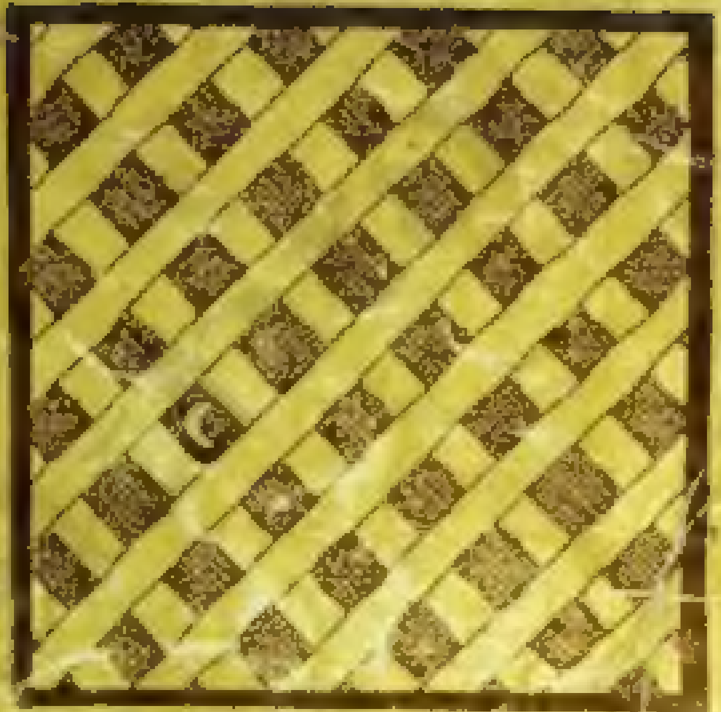

آج کی کتابیں
بی ۲۰۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ایپل کمپیوٹر اب مقامی سطح پر

BUSINESS AUTOMATION (Pvt) LIMITED

Scanned with CamScanner

اس کتاب کی سافٹ کاپی ہماری ادبی ٹیم کے

کے نام

ہیں اس قومی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن بزم کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبرز ذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner